چھیڑ چھاڑ



پرویز یداللہ مہدی

مطبوعاتِ زندہ دلانِ حیدرآباد

۸

جملہ حقوق بحق حق دار رسید (یعنی نصف بہتر کے نام)

بارِ اوّل و آخر : ایک ہزار

سنہ اشاعت : ۱۹۷۴ء

سرورق : سعادت علی خاں

کتابت : سید علی شاہ جی

خوشنویسی : (ابتدائی صفحات) سلام خوشنویسؔ

سُرخیاں : سید نصرت

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان۔ حیدرآباد ۲

بائنڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پُرانی حویلی۔ حیدرآباد ۲

قیمت : کم از کم ۹ روپے (زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں)

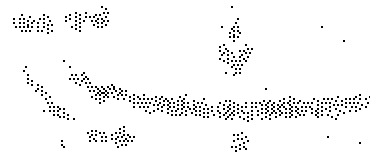
ناشر :

زندہ دلانِ حیدرآباد ۲۷۔ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۱

ملنے کے پتے :

ادبی ٹرسٹ بک ڈپو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد ۱

مکتبۂ جامعہ، پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳





گنگا جمنا میں ڈھلی ــــ دکن میں پلی

اُس زندہ زبان کے نام

جو زندہ دِلوں کی بھیڑ میں

میری پہچان

کا

ذریعہ بنی



پرویز

ترتیب

پرویز ——— بیدی!

طنز و مزاح پرویز یداللہ مہدی کا اوڑھنا بچھونا ہے، جسے وہ کچھ یوں استعمال کرتے ہیں کہ ان کا چہرہ، ٹخنے، پاؤں کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ انگڑائی لینے پر بھی پورے قد کا اندازہ نہیں ہوتا، کیونکہ جب آپ کی نظریں پیمائش کرنے لگتی ہیں تو وہ دُہرے ہو جاتے ہیں۔ پھر دو سے ضرب دینے پر کیا حساب ٹھیک ہو سکتا ہے؟

ہر فقرے، ہر سچویشن کو اُلٹنے، پلٹنے اور اسے مضحک دکھانے میں مہدی یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ایک ہنسی اور دوسری کے بیچ وقفہ ہونا چاہیے۔

بہر حال، میں نے ایک طریقہ وضع کر لیا، ان سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا — یعنی میں نے ہر فقرہ پڑھنے کے بعد رسالہ بند کر دیا اور اُس وقت تک بند کیے رکھا جب تک کہ کام و دہن میں اس کا ذائقہ رہا ——— پھر مضمون کا اگلا حصہ شروع کیا اور یوں میں نے اِن کے چار پانچ مضامین چودہ پندرہ دنوں میں ختم کیے۔

مہدی کے مضامین پڑھ کر ایک مطلع تو صاف ہوا کہ ان کے ہونٹ کھلے ہیں، آنکھیں کھلی ہیں، کان بھی کھلے ہیں۔ اس پر بھی اُنھوں نے سرِ حق دیکھ لیا ہے اور ہم کو ہنس رہے ہیں ——— وہ یہ راز بھی پا گئے ہیں کہ بچھو بوٹی کے کاٹے کا علاج بوٹی ہی کے آس پاس بھانگ کے پودے کی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ ایک سانس میں کاٹتے، دوسرے میں مرہم لگاتے اور پھر کاٹنے میں لگ جاتے ہیں۔

——— ان کا ایک کردار تیسری منزل سے گرتا ہے اور آسمان پر پہنچ جاتا ہے ———
——— اس سلسلے میں مجھے اپنی ایک فلم یاد آتی ہے، جس میں ایک استاد اسپیچ

شاگرد کو محبت کے گر سمجھاتا ہے ـــــ دیکھو جمورے، جب چھوکری تمہاری طرف دیکھے تو کبھی اُس کی طرف مت دیکھو ـــ تم اُوپر دیکھو جیسے تمہاری چوٹی آسمان پر گر گئی ہو ـــ شاگرد کہتا ہے : استاد! چوٹی گرے گی تو زمین پر، آسمان پر کیسے گرے گی ؟ جب استاد زنّاٹے سے ایک تھپڑ اُسے رسید کرتا ہے اور کہتا ہے: چُغد! یہ عشق کا مضمون ہے، عاشق کی چوٹی جب گرتی ہے، آسمان پر گرتی ہے!

مہدی، اس قدر چوکنے ہیں کہ ہر فقرہ وضع کرتے ہی اُس کے ہر ممکن معانی، ورگر دانیں، ان کے ذہن میں آجاتے ہیں، جنھیں وہ یوں استعمال کرتے ہیں، جیسے کوئی شعبدہ باز ـــ بیک وقت چار چھ گیندیں اُچھالتا ہے اور جو زمین پر گرتی ہے وہ گیند نہیں، ہماری نظر کا دھوکا ہے!

میں، مہدی سے اور مضامین فراہم کر کے انھیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن سوچا، ایسے میں اپنی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی !!

راجندر سنگھ بیدی

(راجندر سنگھ بیدی)

۱۰ر دسمبر ۷۴ء ۔ بمبئی

بک رہا ہوں جنوں میں...

(زیرِ نظر "پیشِ لفظ" کافی "پس و پیش" کے بعد لکھا ہے۔ اور ڈر ہے کہ ایسے نقاد جنھیں جراحِ سخن کہنا غلط نہیں ہو گا اس میں سے بیشتر الفاظ اپنی مرضی سے مختلف جملوں میں استعمال کریں گے۔ کیونکہ کسی اور کے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کرنا بہت آسان ہے.....)

میرا پہلا اور غالباً آخری مجموعہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جو یقیناً جلد یا بہ دیر طاقتوں یا فٹ پاتھوں پر پہنچ جائے گا۔ (سچ ہے اعمال کی سزائیں بھی بھگتی جاتی ہے) اس سے پہلے کہ میری تحریر میں چھپی تلخی سے آپ کے منھ کا مزہ کڑوا ہو، ایک لطیفہ سنیئے.... مدتوں بعد جب ایک ادیب کی اپنے ایک دیرینہ رفیق سے ملاقات ہوئی تو ادیب نے یہ خوشخبری سنائی.. یار تمھیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ میری کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ جواب میں دوست نے اسے مبارک باد دی، اور پوچھا۔ کچھ بکی بھی...؟ ادیب نے ٹھنڈی سانسوں کے درمیان بتلایا... اب تک میری سیکل اور گھڑی بک چکی ہے...! ہو سکتا ہے یہ لطیفہ پڑھ کر آپ کے منھ کا مزہ بہت کڑوا ہو گیا ہو، لیکن کیا کیا جائے۔ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ اس لطیفے کو آپ کسی بھی اردو ادیب یا

شاعر سے منسوب کر سکتے ہیں۔ آج اُردو میں لکھنا اور لکھ کر کمانا ایسا ہی ہے جیسے امریکہ میں بے چارے نکسن کا دوبارہ برسرِ اقتدار آنا۔ آج کے اُردو ادیب کا المیہ یہ ہے کہ اُسے اچھا قاری نہیں ملتا۔ باہر کی بات چھوڑیئے خود اس کے گھر میں اس کا کوئی قاری نہیں ابھی کچھ دن پہلے ایک مشہور اُردو ادیب کی "کانونٹ یافتہ" صاحبزادی سے میں نے ان کے والدِ محترم کے تازہ ترین مضمون کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا چاہا تو صاحبزادی نے بڑے ہی فخر سے بزبانِ انگریزی یہ اعتراف کیا کہ وہ اُردو سے نابلد ہیں اس لئے والد محترم کی کسی تخلیق کو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مظلوم اُردو زبان کی پیٹھ میں اس تلخ اعتراف کا خنجر بھونکنے کے بعد مزید فرمایا کہ جب ان کے والد صاحب کی تخلیقات ہندی انگریزی یا کسی اور مقامی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوں گی تب وہ انہیں بصد شوق پڑھیں گی، پھر تبادلۂ خیال کے موقف میں ہوں گی۔

اب آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ، جب اس بھیانک اور تلخ انجام کی خبر تھی تو پھر، آ بیل مجھے مار، والے اس تماشے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں آپ یہ بھول رہے ہیں کہ ایک ادیب اور عام آدمی میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ ویسے ادیب بھی اشرف المخلوقات کے زمرے میں آتا ہے لیکن عام آدمیوں کی اکثریت انا یعنی کھلائی کی گود میں پل کر جوان ہوتی ہے جبکہ ادیب "انا" کو پالتا ہے۔ اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کے سُرخاب کے پر لگے ہیں۔ جس کی جھلک عوام کو دکھلانے کے لئے اپنے صرفے خرچے سے اپنے مجموعے چھپواتا ہے۔ چنانچہ اس مجموعے میں میرے سُرخاب کے پر تلاش کیجئے۔

کہاوت ہے کہ جب گیدڑ کی شامت پکارتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اسی طرح جب ایک ادیب یا شاعر کے دن جوانی ہی میں پورے ہو جاتے ہیں تو اس کے سر میں جیتے جی اپنا مجموعہ چھپوانے کا سودا سما جاتا ہے جو ہر اعتبار سے گھاٹے کا سودا ہے۔

حلقۂ احباب کو جب کسی ادیب یا شاعر سے انتقام لینا ہوتا ہے تو اس غریب کا مجموعہ چھپوانے کی سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ابتدا میں بے چارہ ادیب اِن سازشوں کو سمجھ نہیں پاتا اور جب وہ اِس بات کی تہہ تک پہنچتا ہے یا اِس بات کی تہہ اس تک پہنچتی ہے تو بات ہونٹوں سے نکل کر کوٹھوں تک پہنچ چکی ہوتی ہے۔ اور اِس بات کو دوبارہ کوٹھوں سے ہونٹوں تک لانے کے لیے، نو منوں کے پل باندھنے پڑتے ہیں لیکن اِن پلوں کو باندھنے کی کوشش میں وہ سارے پل ایک ایک کر کے گرنے شروع ہو جاتے ہیں جب بے چارے ادیب کو ایسے دوستوں اور مداحوں سے ملاتے ہیں جنکی مالی حیثیت کسی قدر اچھی ہوتی ہے۔۔۔ پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب ایک ادیب اور ایسے شخص میں کوئی فرق نہیں رہتا جو رات میں تو بھلا چنگا سوتا ہے لیکن جب سویرے بیدار ہوتا ہے تو خود کو وہاں پاتا ہے جہاں سے اس کو کچھ اپنی خبر نہیں آتی۔۔ اکثر ادیبوں اور شاعروں کے نصیب میں ایسی ایک 'خطرناک رات' ضرور لکھی ہوتی ہے۔ ویسے سہاگ رات بھی اسی زمرے میں آتی ہے (اس میں مرد اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے اور عورت سب کچھ پا جاتی ہے) البتہ سہاگ رات بلا تفریق جنس جہاں بہتوں کو صاحبِ اولاد بناتی ہے۔ وہیں دوسری خطرناک رات بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو "صاحبِ کتاب" بنانے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔

اکثر ادیب و شاعر سہاگ رات کی مہربانیوں کی وجہ سے

"بوجھ وہ آن پڑا ہے کہ اٹھائے نہ بنے" والی کیفیت سے دوچار نظر آتے ہیں، ناچیز اِس سلسلے میں خوش قسمت ہے کہ اب تک صرف دو غلطیاں ہی سرزد ہوئی ہیں۔۔۔ لیکن ایک صبح جب آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ جو رات سر پر سے گزری ہے وہ وہی خطرناک رات تھی۔ لاکھ بچنا چاہا۔ بہتیرا ترکیبیں لڑائیں لیکن سب بے سود، بلکہ سود تو سود اصل بھی غائب۔۔۔ سچ ہے بندوق سے نکلی ہوئی گولی اور زبان سے نکلی ہوئی بولی،

دوبارہ واپس آتی ہے نہ آسکتی ہے۔ اس مجموعے کو آپ کے ہاتھوں تک پہنچانے کیلئے کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑا یہ ایک داستانِ خونچکاں ہے اور اس داستانِ امیر حمزہ میں آپکو سوائے دکھوں اور پریشانیوں کے کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا آپ صرف آم کھائیے، دام دیئے ہیں تب بھی بے دام حاصل کئے ہیں تب بھی پیڑ گن کر خواہ مخواہ میرے دکھ بٹانے کی کوشش مت کیجئے۔ اور اگر کچھ بوجھ ہلکا کرنا ہی ہے تو حلقۂ احباب میں کتاب کی تعریف ضرور کیجئے (جھوٹی ہی سہی) میں یہ نہیں کہتا کہ میرے مضامین کی تعریف کیجئے، مضامین کے علاوہ بہت ساری باتیں ایسی ہیں جن کی تعریف کی جاسکتی ہے۔ مضامین کی تعریف میں میرا ہی نقصان ہے، ہو سکتا ہے تعریف کے نشہ میں بھول کر پہلے دھکے کے سارے مالی و جسمانی نقصانات بھول کر دوسرا مجموعہ چھپوانے کی کوشش میں میری روح مجھے زمین کے نیچے دراز کر کے خود قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے۔

تمہید ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔ لیجئے اب تعارف حاضر ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے اور کیسے شروع کروں۔ سوچتا ہوں اگر میں بھی کوئی مشہور و مستند ادیب ہوتا تو اس شعر کا سہارا لے کر آسانی سے پیچھا چھڑا لیتا ... ؎

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے دیکھا ہے کہیں پڑھا ہے کہیں

(دوسرا مصرع گرچہ بے وزن ہو گیا ہے لیکن یہاں مطلب برآری سے کام ہے)

صدیوں سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ پہلی کتاب میں تعارف کے بہانے ایک ادیب خود اپنا کچا چٹھا کھول کے رکھدے تاکہ اس "کچے چٹھے" کے خالق کو "الو کا پٹھا" سمجھ کر باذوق قارئین اس کے لئے دعائے مغفرت کر سکیں۔ سنا ہے قارئین کی اکثریت ایک ادیب یا شاعر سے اس کے گناہوں کا حساب مانگتی ہے۔ جہاں تک میرے کردہ و ناکردہ

گناہوں کا تعلق ہے اتنے زیادہ ہیں کہ قیامت تک شمار میں نہیں آسکتے۔ بہرحال میری زبانی سنیئے داستان میری، لیکن مجھے ڈر ہے اس میں آپ کو شاید ہی مزاح کی جھلکیاں ملیں۔ ایک مزاح نگار سے پڑھنے والوں کو یہ توقع رہتی ہے کہ وہ انہیں ہنسائے گا، چونکائے گا۔ واہ یا آہ پر مجبور کرے گا۔۔ میری یہ تحریر اگر آپ کو ہنسانے اور چونکانے میں ناکام رہی تو خدا کے لئے مجھ پر لعنت مت بھیجئے۔ کیونکہ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں ایک مزاح نگار ہوں۔ ویسے ایک مزاح نگار کی مختصر سی تعریف یوں بیان کی جاتی ہے کہ اسکی تحریر پڑھ کر ہنسی اور صورت دیکھ کر رونا آتا ہے۔ جبکہ بیشتر قارئین کا کہنا ہے کہ میرے مضامین پڑھ کر رونا اور صورت دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔۔۔

ویسے یہ سچ ہے کہ ایک مزاح نگار جو دنیا بھر کو طرح طرح سے ہنسانے کی کوشش کرتا ہے خود اسکی آنکھوں میں بے شمار آنسو چھپے ہوتے ہیں۔ سماجی برائیوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنانے والا مزاح نگار خود کبھی کبھی قدرت کے بھیانک مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے اس کی زندہ مثال میں خود ہوں۔ ادب سے گہرے لگاؤ اور دلچسپی کے باوجود قدرت کی ستم ظریفی نے مجھے ریفریجریشن انجینرنگ کے سرد و گرم میدان میں زبردستی دھکیل دیا۔ بیشتر رشتہ دار خصوصاً خواتین مجھے ٹھنڈا گرم انجینر کہتی ہیں، میں نے اس فن میں اگرچہ بمبئی کے مختلف فنی اداروں سے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما حاصل کئے ہیں لیکن ادبی دنیا میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ بجائے اس کے اگر میں نے "منشی فاضل" کی سند حاصل کی ہوتی تو آج ایک مستند ادیب مانا جاتا۔ لیکن "منشی فاضل" تو کجا "منشی فضول" ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لئے بلند پایہ ادیبوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا۔ "دوپایہ" ہوں اور "دوپایہ" ہی رہنا چاہتا ہوں۔ البتہ انجینرنگ کے ڈپلوما سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ادبی دنیا میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے والے سیاست داں قسم کے ادیب اس ڈر سے مجھے نہیں چھیڑتے کہ میرے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے۔ جہاں قلم کی

نہیں چلتی وہاں ہتھوڑے سے کام لیتا ہوں۔

اب آیئے میرے خاندانی تاریخ جغرافیہ کی طرف .. چچا غالب کی طرح میرے آبار کا پیشہ بھی سپہ گری رہا ہے۔ ان کا سو پشت سے یہ پیشہ رہا ہے اور میرے آباد کا سات، آٹھ پشت سے۔ سپہ گری کے ساتھ پیری مریدی بھی کیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں ہمارا سلسلہ شہنشاہِ دکن حضرت سید محمد خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے ملتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرا تعلق فرقۂ مہدویہ کے سادات گھرانے سے ہے۔ والد صاحب خاندان کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی، شوق اور محنت کی وجہ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔

اب میرے شخصی تاریخ جغرافیہ" کا احاطہ ہو جائے۔ پہلے جغرافیہ ملاحظہ فرمایئے۔ (نمونے کے لئے تصویر دیکھئے افسوس قدِ آدم نہیں ہے۔ صرف چہرہ دیکھ کر بقیہ جغرافیہ کا اندازہ لگا لیجئے)

میرا نام سید یداللہ حسینی ہے۔ گھر کے لوگ یداللہ پاشا کہتے ہیں، قلمی نام پرویز مہدی ہے۔ فلمی نام کچھ بھی نہیں۔ (اگر پردۂ فلم پر نمودار ہونے کا چانس ملتا تو فلمی نام بھی ہوتا) ادبی دنیا میں پرویز یداللہ مہدی کے نام سے پہچانا کم اور جانا زیادہ جاتا ہوں کہ اس دور میں آدمی کی پہچان اس کی حیثیت اور روپے سے ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو مجھ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ میرے نام کو حجم کے اعتبار سے مجھ سے بھی بھاری بھرکم سمجھتے ہیں اور جو مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں ان کا کہنا ہے اگر میں اپنے پورے نام کو منظرِ عام پر لاتا یعنی "سید یداللہ پرویز مہدی حسینی" کے نام سے لکھتا تو شائد میرے حجم اور قد و قامت کے ساتھ کسی حد تک انصاف ہوتا۔ قد و قامت اور حجم پر اسقدر زور دینے سے کہیں یہ نہ سمجھئے کہ میں الف لیلوی قصہ کا کوئی دیو یا جن ہوں۔ میرا قد صرف چھ فٹ ایک انچ ہے اور وزن دو سو پونڈ کے لگ بھگ

اس حساب سے میرا موجودہ قلمی نام نہایت موزوں ہے۔ (اس بات کی تصدیق کے لئے یوسف ناظم صاحب کی رائے ملاحظہ فرمایئے)

اب آیئے تاریخ کی طرف۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سنہ ۱۹۴۳ء کے ماہ جون کی اکیس تاریخ کی کسی گھڑی گہوارہ علم و ادب، مرکز شعر و سخن حیدر آباد دکن میں میری آنکھ کھلی جو ابھی تک کھلی ہوئی ہے۔ کب بند ہو گی کہہ نہیں سکتا۔ بچپن کا رنگین زمانہ، مردانہ و زنانہ ہر قسم کے کھیل کھیلتے ہوئے گزرا۔۔ اسکول کا ریکارڈ ملاحظہ فرمایئے تحتانوی جماعتوں میں اگلی بنچ پر، وسطانوی جماعتوں میں درمیانی بنچ پر اور فوقانوی جماعتوں میں پچھلی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات بنچ پر کھڑے ہونے کی سعادت بھی حاصل ہوا کرتی تھی۔ جب فوقانیہ سے "شیطانیہ" یعنی کالج کے احاطے میں قدم رکھا تو اسکول کی قید اور پابندیوں کا ازالہ ہو گیا۔ چنانچہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے تین سو چونسٹھ دن پرانے باغ عام، پرانے شہر کی پرانی چھپرا ہوٹلوں اور سینما گھروں میں گزرے، نتیجتہً زندگی میں پہلی بار محترمہ "ناکامی" سے ہاتھ ملانا پڑا۔ یہ ذہنی جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ اگلے سال بھر کے لئے ہر قسم کی تعلیمی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر کے ہر قسم کی خارج از نصاب" سرگرمیوں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگا۔ والد صاحب کو جب میری اِن سرگرمیوں کا علم ہوا تو دوڑے دوڑے آئے اور مجھے زبردستی شہر نگاراں بمبئی لے گئے۔ والد صاحب سنہ ۱۹۵۸ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم کی زد میں آ کر مہاراشٹرا چلے گئے تھے۔ ایک عرصہ تک بمبئی مجھے اور میں بمبئی کو آزماتا رہا اس آزمائش کے نتیجے میں جہاں بہت کچھ کھویا، وہیں بہت کچھ پایا۔ بمبئی نے جہاں مجھے اپنے پن کا احساس بخشا وہیں اپنے وطن کے لئے اجنبی بن گیا۔ جس سرزمین پر میں نے آنکھ کھولی پلا بڑھا اور شباب کے حدود میں داخل ہوا، وہی میری نہ رہی ... ہو سکتا ہے وہ سرزمین اب بھی میری ہی ہو، میں ہی اس کا نہیں رہا۔

جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے کسی پیشہ کا مستقل غلام کبھی نہیں رہا۔ فری لانسنگ کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ جز وقتی لیکچرر شپ سے لے کر ریڈیو کے لئے ڈراموں، کہانیوں اور فلموں کے کمرشیل پروگرام تک لکھے ہیں۔ اور لکھتا ہوں۔ جب اِس سلسلے میں خواہ مخواہ چرچے ہونے لگے تو کچھ کرم فرماؤں نے فلمی دنیا میں مقدر آزمانے کا مشورہ دیا۔ لیکن "مکھن بازی" کے فن میں چونکہ کورا ہوں اِس لئے آج بھی اپنی دال گلتی نظر نہیں آتی حالانکہ ایک عدد چولھا خود چل کر میری دال تک پہنچا ہے۔ دیکھنا ہے دال گلتی ہے یا جلتی ہے۔

لکھنے لکھانے کا شوق مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ والد صاحب کسی زمانے میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ جو اس دور کے مشہور جریدوں میں چھپ چکے ہیں۔ بیشتر اردو ادیبوں کی طرح میں نے بھی شاعری کے نام پر تک بندی سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ البتہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس زمانے میں کہیں چھپنے کا شوق نہیں چرایا۔۔ دوستوں کے جمگھٹوں اور گھریلو محفلوں میں ہنسنے ہنسانے کی ذمہ داری چونکہ اکثر میرے سر ہوا کرتی تھی اِس لئے جب قلم سنبھالا تو اپنے فطری رجحان کے باعث طنز و مزاح کا انتخاب کیا۔ ویسے ادب کے ہر صنف سے چھیڑ خانیاں کی ہیں اور خوب چھپا بھی ہوں لیکن چھپنے چھپانے کو چونکہ سند نہیں مانتا اِس لئے اُن سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری پرچوں کی طویل فہرست گنوانا سراسر بے وقوفی ہے جن میں چھپتا رہتا ہوں۔

بعض مدیرانِ کرام چونکہ تخلیق کے معیار کا اندازہ تخلیق کار کی ڈگری سے لگاتے ہیں اِس لئے ایسے مدیران کرام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے مجھ سے یہ بے وقوفی بھی سرزد ہوئی لیکن ڈگری حاصل نہ کر سکا کیونکہ میری شادی ہوگئی اور شادی جیسا کہ ظاہر ہے ایک ایسی ڈگری ہے جس کے آگے یونیورسٹی کی بلکہ عدالتی ڈگریاں بھی کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ لیکن اِس سلسلے میں پتہ نہیں کون سی نیکی آڑے آگئی جو صابرہ نے اُس ڈگری

کو بالائے طاق رکھدیا (ہو سکتا ہے قریبی کے اس پروگرام کو کسی اور وقت روبہ عمل لانے کا ارادہ ہو) میں صابرہ کا اِس بات کے لئے بھی ممنون ہوں کہ وہ مجھ جیسے لاابالی اور غیر ذمہ دار شخص کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ویسے انہیں بھی اوروں کی طرح مجھ سے یہ شکایت ہے کہ والدین کے بے جا لاڈ پیار نے مجھے اِس حد تک بگاڑ دیا ہے کہ اب سدھرنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ لیکن اِس کے باوجود مجھ سے نباہ کرنیکی کوشش کر رہی ہیں (خدا کرے کہ میرے آخری سانس تک وہ یہ کامیاب کوشش کرتی رہیں)

یوں تو میرا وجود کئی کمزوریوں اور خامیوں کا مرکب ہے لیکن یہاں اپنی اِس کمزوری کا اعتراف کرتا چلوں، پہلے تو کسی کو اپنا نہیں سمجھتا، لیکن جب کسی کو اپنا سمجھنے لگتا ہوں تو اس سے خواہ مخواہ ڈھیر ساری توقعات وابستہ کر لیتا ہوں۔ نتیجتہً اِس شاعرانہ اُداسی کا اکثر شکار ہو جاتا ہوں۔ ؎

چند کلیاں نشاط کی چن کر ؎ مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی ؎ تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

کہتے ہیں کسی ادیب کا تعارف اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے اِن پسندیدہ ادیبوں کے نام نہ گنا لے جن سے اتنا زیادہ متاثر ہوتا ہے کہ اُسکی اپنی تحریروں میں ان ادیبوں کی تحریروں کی جھلک ملنے لگتی ہے۔ (بعض اوقات صرف جھلک ہی نہیں بلکہ تحریریں ہو بہو لفظ بہ لفظ وہی ہوتی ہیں جسے محض اتفاق کہہ کر دامن بچانے کی کوشش کی جاتی ہے) اکثر لوگ اپنے مطالعے کی دھاک جمانے کیلئے غیر ملکی ادیبوں کے ثقیل اور ناقابلِ ہضم نام گناتے ہیں۔ جہاں تک مزاح نگاروں کا تعلق ہے اکثر حضرات "مارک ٹوین، اسٹیفن لیکاک، پی۔ جی۔ ووڈ ہاوز اور رابرٹ لینڈ" کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ جب میں نے پہلی بار اِن حضرات کے نام سنے تو یقین ملنے کوئی مجھے سرکس کا جوکر لگا تو کوئی کسی کوٹھی کا چوکیدار۔ لیکن جب کچھ عرصہ بعد انکی تحریریں

پڑھنے اور مختلف ڈکشنریوں اور لغتوں کی مدد سے انہیں سمجھنے کا موقع ملا تو محسوس ہوا کہ میں اگر ان کو نہ پڑھتا تو لوگ مجھے نہ پڑھتے۔ (اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھ کو پڑھنے کے بعد ان کو یا ان کو پڑھنے کے بعد مجھ کو پڑھنے کی حاجت نہیں رہتی۔ بعض اوقات ان کو پڑھنے کے بعد مجھ کو اور مجھ کو پڑھنے کے بعد انکو پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغیر پڑھے کسی پر سرقہ کا الزام نہیں تھوپا جا سکتا۔)

اب آیئے ملکی ادیبوں کی طرف، لفظ ملکی سے میری مراد صرف تلنگانہ کے ادیب نہیں بلکہ ہندوستانی ادیب ہیں۔ اپنی زبان کا ادیب کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو ہم پہلے غیر ملکی ادیبوں کے نام گناتے ہیں۔ سچ ہے گھر کی مرغی ہمیشہ دال برابر ہوتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی دال سے بھی گئی گذری ہوتی ہے۔ اب مجھے ہی دیکھئے اُردو کا کتنا بڑا مزاح نگار ہوں کم از کم قد کے اعتبار سے (چھ فٹ ایک انچ قد کم نہیں ہوتا) لیکن اُردو کا چھوٹے سے چھوٹا نقاد بھی مجھے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ ایک مرتبہ بخار کے دوران پطرس بخاری کے مضامین کا مجموعہ ہاتھ لگ گیا۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے جسمانی بخار تو اُتر گیا۔ لیکن لکھنے کا بخار پوری شدت کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اور آج تک سوار ہے۔ طنز و مزاح کے مختلف ڈاکٹروں و حکیموں سے رجوع کیا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اِن ڈاکٹروں و حکیموں کے جو نسخے مختلف مجموعوں کی شکل میں ملے انہیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ یہ بے چارے خود طنز و مزاح کے مہلک جرثوموں کے شکار ہیں۔ اور ڈاکٹری کے بہانے خود اِس مرض کو پھیلانے کا "مشن" چلاتے ہیں۔۔ اگر میں اِن کے نام گناؤں جو راہی ملکِ عدم ہو چکے ہیں تو وہ دوبارہ اِس جہانِ خانہ خراب میں لوٹنے کی کوشش کریں گے اور جو خم ٹھونکے ابھی تک زندگی سے دست و گریباں ہیں۔ مارے خوشی کے ایسی پچھاڑ کھائیں گے کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکیں گے۔۔ البتہ یہاں خصوصیت کیساتھ

ابن صفی کا ذکر ضرور کروں گا کہ فریدی، حمید اور عمران جیسے زندہ جاوید کرداروں کے اس خالق نے ایک نسل کی ذہنی تربیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ (ہو سکتا ہے کچھ نام نہاد نقاد اور ادب کے گتہ دار ابن صفی کی منفرد تحریر پر "جاسوسی ادب" کا لیبل چڑھا کر اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھتے ہوں۔ اور اپنی جھوٹی "ساکھ" کو برقرار رکھنے کے لئے صحیح اعتراف کرتے سے گھبراتے ہوں) ابن صفی کے قلم میں جو روانی اور طنز و مزاح کی چاشنی ہے وہ انہیں ایک منفرد طنز و مزاح نگار کہلوانے کے لئے کافی ہے۔

شاعروں میں چچا غالب اور علامہ اقبال کی میرے دل میں بے انتہا قدر ہے ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلے تو یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور جب مختلف شرحوں کی مدد سے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے تو بیٹھے بٹھائے تشریح کی سوجھتی ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں اٹھتا تاکہ ہر شخص اسے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق سمجھتا ہے یا سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ چچا غالب سے میری عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میں نے انکی ذاتِ بابرکات پر مرثیہ کے ردیف میں جو مضمون شروع کیا تھا وہ ختم ہوتے ہوتے ایک عالی شان قصیدہ بن گیا۔

اس سے پہلے کہ میں اس خرافات کا خاتمہ بالخیر کروں، مجھے ایک ناخوشگوار فریضہ انجام دینا ہے۔ یعنی ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے تعاون کے بغیر یہ مجموعہ چھپ ضرور جاتا لیکن منظرِ عام پر نہیں آسکتا تھا۔ یہ فریضہ میرے لئے اس واسطے بھی ناخوشگوار ہے کہ ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود اپنا شکریہ ادا کرنا۔ ان حضرات میں مولانا مولوی عطا طنز مصطفیٰ کمال المتخلص بہ شگوفہ کمال صاحب کا نام نامی سرِفہرست ہے۔ موصوف اردو کے واحد مزاحیہ ماہنامہ "شگوفہ" کے ذریعہ ہر ماہ قہقہے تقسیم کرتے ہیں۔ شگوفہ کی اولین اشاعت میں کمال صاحب نے خود کو مزاح کے تاجر کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ لیکن شگوفہ کی سات سالہ تاریخ بتاتی ہے کہ

طنز و مزاح کی آئندہ تاریخ بلکہ جغرافیہ میں سائنس کے اس گرہ بجوٹ اور اردو کے پوسٹ گریجویٹ کو "مزاح گر" کے نام سے یاد کیا جائے گا بلکہ وہی مقام دیا جائے گا جو امریکہ کی دریافت پر کولمبس کو ملا ہے . . میری تحریر کی شوخیوں کو اپنے شگوفوں میں مٹھنے اور مہکنے کے مواقع فراہم کر کے کل کے "گمنام افسانہ نگار" کو آج کا "بدنام مزاح نگار" بنانے میں شگوفہ گمال صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ہے . بلکہ اپنی روز افزوں بڑھتی ہوئی "بدنامی" کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہوں کہ میری "تباہی" میں موصوف کے دونوں ہاتھ ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

"چھیڑ چھاڑ" کے روپ میں یہ جز بجوں جوں کا مرتبہ "آپ کے ہاتھوں میں ہے اس بجس کو چنگاری دکھانے کے ذمہ دار دو عدد انتہائی شریف حضرات ہیں جو بدقسمتی سے میری ہی طرح بار ریش ہیں . کہاوت ہے کہ داڑھی والے کا کیا کرایا مونچھ والا بھرتا ہے اور مونچھ والے کی کرنی داڑھی والے کو بدنام کرتی ہے ، لیکن مجھ داڑھی دار کو بدنام کرنے میں باریش حضرات ہی پیش پیش رہے ہیں . وہ بھی دو عدد یعنی ایک نہ شد دو شد۔ میرا اشارہ ساتھی مزاح نگار مسیح انجم اور رشید عبد السمیع جلیل کی طرف ہے مسیح انجم کی جان لیوا مسیحائی اس زندہ وجود کو یقیناً مردہ ثابت کر کے رہے گی ۔ ان معنوں میں کہ ادب میں "مردہ پرستی" کا چلن بڑا پرانا ہے ، یعنی بے چارے ادیب یا شاعر کا نام اچھالنے کے لئے اس کی موت کا انتظار کیا جاتا ہے بلکہ بعض صاحب خیر حضرات تو اس انتظار سے اکتا کر بے چارے کو وقت سے پہلے موت کے منھ میں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں . جب کہ مسیح صاحب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر ادیب کو (کم از کم ہر مزاح نگار کو) اس کی زندگی میں ہی بانس پر چڑھا دیا جائے . . . چنانچہ جس بانس پر مجھے چڑھایا گیا ہے ، دیکھنا ہے وہ کب تک میرا بوجھ سہتا ہے ؟ مجھے بانس پر چڑھانے کے بعد سنا ہے مسیح صاحب حسب عادت قدیم "رانگ سائیڈ" کھڑے ہو کر دوسروں کو اس بات کی تلقین کر رہے ہیں کہ "سائیڈ سے چلئے . . . "!

دوسرے بارِش حضرت ہیں رشید عبدالسمیع جلیل۔ شاعری کے میدان میں کامیابی سے ڈبل رول ادا کرنے والے یہ نوجوان صورت سے بے حد سنجیدہ نظر آتے ہیں بلکہ ان کی سنجیدگی کبھی کبھی "رنجیدگی" کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کی حسِ مزاح "بہت ہی تیز بلکہ طرار ہے۔ موصوف میرے ہر مضمون میں طنز و مزاح کے ایسے ایسے تیر و نشتر ڈھونڈ نکالتے ہیں جن کا خود مجھے پتہ نہیں ہوتا۔ زبان کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود زبان بہت کم ہلاتے ہیں البتہ قلم بہت زیادہ چلاتے ہیں ۔ تصحیح کی ذمہ داری موصوف نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی لیکن اس کے باوجود بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو نہ انہیں موردِ الزام ٹھہرایئے اور نہ ہی کاتب صاحب کو بلکہ روزِ حشر میرا گریبان پکڑیئے ... تصحیح کا ذکر چونکہ چھڑ ہی گیا ہے اس لئے عزیزی اشرف نہال مہدی کا شکریہ ادا کر کے ایک اور بوجھ ہلکا کرتا چلوں..

اشرف حیدرآباد میں خود کو میرا P.R.O. یعنی پبلک ریلیشن آفیسر بتاتے ہیں۔ لیکن بیشتر احباب سے میرے تعلقات بگاڑنے میں (جو یقیناً جائز تھے) انہی کا ہاتھ رہا ہے اس اعتبار سے انہیں بجائے پی۔ آر۔ او کے R.T.O. یعنی رشتہ توڑ آفیسر کہنا درست ہوگا۔

بعض احباب کا خیال ہے کہ "چھیڑ چھاڑ" میں مزاح اس لئے بھی بڑھ گیا ہے کہ اس کی کتابت دکھنی زبان کے مزاحیہ شاعر شاہ جی نے کی ہے، دوسرے سرخیوں کو سرخاب کے پر لگائے ہیں مشیرآباد کے مشہور کل ہند مقامی مزاح نگار سید نصرت آرکیٹکٹ نے، .. نصرت پہلے تو اس بات پر مصر تھے کہ میں اپنے مجموعہ میں ان کے مضامین دوں۔ لیکن انہیں جب میری بدنامی کا صحیح اندازہ ہوا تو ان کے رال ٹپکنے لگی اور یہ اس اُمید کے ساتھ اپنے مضامین اپنے نام سے چھپوانے لگے کہ بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ لیکن میری بدنامی میں اپنی نیک نامی شامل کرنے

کا جنون چونکہ انکے سر پر سوار تھا اس لئے سرخیاں لگانے کی ذمہ داری زبردستی اپنے سر لے لی تاکہ آئندہ میرے خلاف کم از کم یہ کہنے کے موقف میں رہیں کہ "چھیڑ چھاڑ" میں سوائے سرخیوں کے کوئی چیز قابل مطالعہ نہیں۔

"چھیڑ چھاڑ" کا سب سے تاریک پہلو اسکے مضامین ہیں اور روشن پہلو اسکا ٹائیٹل جو مشہور آرٹسٹ سعادت علی خاں نے بنایا ہے۔ سعادت بھائی آرٹسٹ سے زیادہ بھکاری نظر آتے ہیں، اور بھکاری سے زیادہ آرٹسٹ۔ میرے دل میں سعادت بھائی کا بڑا احترام ہے۔ ایک تو یہ فائن آرٹس اکیڈیمی کے سرگرم کارکن ہیں حالانکہ مزاج کے بیحد نرم اور ٹھنڈے ہیں (ہو سکتا ہے ان سے میری ملاقات ہمیشہ سردی کے موسم میں ہوئی ہو) دوسرے ان کی داڑھی میری داڑھی سے کافی لمبی، سفید اور سینیر ہے۔

"کہتے ہیں اردو کا کوئی بھی ادارہ کسی شاعر یا ادیب کا مجموعہ اسوقت تک قابلِ اشاعت نہیں سمجھتا جب تک کہ اسکے عقل داڑھ نہیں نکل آتی، لیکن زندہ دلان حیدرآباد نے "چھیڑ چھاڑ" کے روپ میں میرا اعمال نامہ پیش کرکے نہ صرف اس روایت سے بغاوت کا ثبوت دیا ہے بلکہ میرے ساتھ ایسے ادیبوں پر بھی اپنا شکریہ فرض کر دیا ہے جو میری طرح ابھی تک عقل داڑھ سے محروم ہیں (ہو سکتا ہے اس مجموعے کی قبل از وقت اشاعت کا سبب صرف یہ اندیشہ ہو کہ عقل داڑھ "نکلتے" ہی میں بجائے عقل کے داڑھ سے سوچنا شروع کر دونگا")

آخر میں جناب اعظم علی صاحب مالک نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، واصل صاحب مالک محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس اور سلام خوشنویس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، چچا غالب کے اس شعر میں ذرا سے تصرف کے ساتھ کہ بھتیجا ہونے کے ناطے اتنا حق تو مجھے بھی حاصل ہے یہ قصۂ طولانی ختم کرتا ہوں ؎ بک چکا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ؛ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

۱ - ادارہ "ہم قلم" ۴۳ - مٹن اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳
۲ - مکان نمبر ۵۲۸ - ۳ - ۱۶ چنچل گوڑہ حیدرآباد

پرویز یداللہ مہدی
یکم دسمبر ۱۹۷۷ء

چھیڑ غالب سے چلی جائے

شروع کرتا ہوں اس کے نام سے یہ مضمون جو اس چچا غالب کی مدح میں ہے جس کی زندگی میں نہ تو سالگرہ ہی منائی گئی اور نہ مرنے کے پورے ننانوے برس تک کسی نے برسی منائی، لیکن پورے سو سال بعد دُنیا بھر نے ان کی صدی مناکر سدا کے لیے انہیں جو کہ پہلے ہی منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں اپنے احسانوں کے بوجھ تلے ایسا دبا دیا کہ بے چارے قیامت تک سر نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ سر اٹھاتے ہی "غالب صدی" کے روپ میں کی جانے والی سنگساری کا خیال آجائے گا۔

یوں تو ایصالِ ثواب پہنچانے کے مختلف طریقے دُنیا میں برسوں سے رائج ہیں۔ کوئی پھول لے کر مرحوم کی قبر پر جاتا ہے تو کوئی مرحوم کے نام پر دو چار مسکینوں کو کھانا کھلاتا ہے (ویسے خود بھی کھا سکتا ہے اگر اس کی اپنی دانست میں قرب و جوار میں کوئی اس سے بڑھ کر مسکین نہ ہو)، جہاں تک ادب کا تعلق ہے خصوصاً اُردو ادب کا تو ہم بڑے مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ زندگی میں کسی شاعر یا ادیب کی مدد کرنا گناہ کبیرہ تصور کرتے ہیں لیکن مرنے کے بعد اس کا نام خوب اچھالتے ہیں۔ اس طرح خود اپنی بگڑی اُن

اُچھالنے کا موقع مل جاتا ہے) البتہ پچھلی ربع صدی سے اُردو ادب میں کچھ انقلاب ضرور آیا ہے۔ بعض شاعروں و ادیبوں کی زندگی میں ہی قدر کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ قدر شناسی اکثر ادیبوں کے حق میں اتنی مہنگی پڑی کہ بے چارے زندہ در گور ہو گئے۔

یوں تو ہر شاعر و ادیب کا زندگی میں ہی استحصال کیا جاتا ہے لیکن ایک مرزا غالب ہیں کہ مر کر بھی جنھیں چین نہیں۔ انتقال کے پورے سو برس بعد بھی لوگوں نے طرح طرح سے ان کا استحصال کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نام کا سہارا لے کر "ایسے ویسے" لوگ "کیسے کیسے" ہو گئے۔ جنھیں ان کا نام بھی ٹھیک سے لینا نہیں آتا جو مرزا غالب کو "مرجا گالب" کہتے ہیں ایسے غرض پرست لوگوں کو بھی چچا غالب نے سرفراز کر کے چھوڑا... چچا تو دوست دشمن سب کے چچا تھے اور ہیں۔ خدا کو بھی جلنے ان کی کون سی ادا بھا گئی جو آج تک کوئی اِن کا چچا نہ پیدا ہو سکا۔ اور نہ آگے اِس کی امید ہے۔

غالب صدی تقاریب کے طفیل نہ صرف مرزا غالب کی شاعری بلکہ اِن کی نجی زندگی کے بارے میں بھی تحقیق و تدقیق کے سینکڑوں دروازے کھل گئے۔ اور یار لوگوں نے صرف جھانک کر دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دھڑلے سے اندر گھس کر کسی ماہر دھوبی کی طرح ان کی شخصیت کو کھنگال کے رکھدیا۔ البتہ جو محققین بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ان دروازوں میں سے داخل نہیں ہو سکے وہ مرزا غالب کی شخصیت میں نقب لگا کر داخل ہو گئے۔ نتیجتاً ایسے ایسے معرکتہ الآرا مضامین و مقالے منظرِ عام پر آئے کہ مرزا غالب کی شخصیت ایک ایسا معمہ بن کر رہ گئی جو نہ سمجھنے کا رہا نہ سمجھانے کا...

کچھ مضامین و مقالوں کے عنوان ملاحظہ فرمایئے۔ "غالب حال کے آئینہ میں"۔ "غالب اپنے آئینہ میں"، "غالب پڑوسن کے آئینہ میں"، "غالب پھیری والے کے آئینہ میں"، غالب بھتیجی آئینہ میں:

غالب صدی کے ہنگاموں نے جہاں لوگوں کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ وہیں بچا کھچا غالب کی زندگی کے بھی ایسے ایسے گوشوں پر سے پردے اٹھائے ہیں جو اب تک تاریکی میں تھے یا جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ایک محقق جدید ان کی پیدائش کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ مرزا غالب دراصل حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن کسی پیدائشی بیماری کے سبب پورے سال بھر تک آنکھیں نہیں کھولیں، اس اثناء میں ان کے والدین حیدرآباد سے ہجرت کر کے آگرہ چلے گئے وہاں پہونچتے ہی مرزا غالب نے پٹ سے آنکھیں کھولدیں۔ اور چونکہ انسان جہاں آنکھ کھولتا ہے وہی اس کا وطن کہلاتا ہے۔ لہذا اس اعتبار سے مرزا غالب آگرے کے کہلائے ... ایک اور محقق فرماتے ہیں کہ مرزا کا نام ان کے کلام کی وجہ سے مشہور ہوا۔ جبکہ دوسرے محقق کا خیال ہے کہ ان کا کلام ان کے نام کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اس کے برخلاف ایک شریر محقق فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نام کا کوئی شاعر گزرا ہی نہیں، جبکہ ایک اور محقق اس بات کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نام کا ایک شخص گزرا ضرور ہے لیکن وہ شاعر نہیں تھا۔ بلکہ اتفاق سے اسکی ملاقات ایک ایسے شاعر سے ہوگئی جو قریب المرگ تھا اور اسد تخلص رکھتا تھا۔ اس نے اپنا سارا کلام اس امید پر غالب کے حوالے کر کے داعی اجل کو لبیک کہا کہ وہ اسے ملک کے کونے کونے میں پھیلائیں، مرزا غالب نے ازراہ ہمدردی و خدا ترسی

مرحوم کے کلام کو ملک کے طول و عرض میں پھیلایا ضرور۔ لیکن تخلص کی تبدیلی کے ساتھ۔

نقادوں میں غالباً اس بات پر کوئی "انڈر گراونڈ" قسم کا سمجھوتہ ہوتا ہے کہ ایک نقاد اگر کسی شاعر یا ادیب کی تعریفوں کے پل باندھ کر بانس پر چڑھائے تو دوسرا اس بری طرح اسکی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹے کہ بیچارہ شاعر یا ادیب زندگی بھر لنگڑاتا رہ جائے۔ مثال کے طور پر ایک نقاد اگر مرزا غالب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا نقاد انڈر گراونڈ سمجھوتے کے تحت یہ ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے کہ مرزا غالب سرے سے شاعر ہی نہیں تھے، اور اگر تھے بھی تو کم از کم اُردو کے شاعر نہیں تھے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اُردو ہی وہ واحد زبان ہے جس میں کسی بھی شاعر یا ادیب پر تحقیق و تنقید کے لیے محقق کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر اُردو داں جو شدھ بدھ اُردو پڑھ لکھ لیتا ہو یا صرف سمجھ لیتا ہو وہ بھی بلا روک ٹوک بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب پر تحقیق یا تنقید کر سکتا ہے۔ جہاں تک مرزا غالب کا تعلق ہے تو ان پر تحقیق یا تنقید کرنے کے لیے زبان کی بھی قید نہیں۔ یہ حق چچا غالب خود دے گئے ہیں تحریری طور پر دے گئے ہیں یا صرف زبانی، اس پر ہنوز تحقیق جاری ہے۔ ہوسکتا ہے اس بات کا علم ہونے تک ان کے اتنے بخیئے ادھیڑے جاچکے ہوں گے کہ نہ تو مرزا غالب کا نام رہے گا نہ ان کا دیوان، اگر کچھ باقی رہے گا تو چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط۔

اُردو کے بیشتر نقادوں کو اگر "جراحِ سخن" کہا جائے تو غلط

نہیں ہوگا۔ یہ "جراحِ سخن" کسی شاعر یا ادیب کی قلمی کاوشوں کو یکسر نظر انداز کر کے نہ صرف اس کی نجی زندگی بلکہ اس کے متعلقین پر بھی رکیک قسم کے حملے کر جاتے ہیں، کبھی شاعر کی محبوبہ کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی یہ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ شاعر کی محبوبہ کوئی عورت نہیں تھی بلکہ ایک کمسن لڑکا تھی، بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ وہ لڑکا بھی نہیں تھی بعض "جراحِ سخن" بیٹھے بیٹھے یہ فتنہ چھوڑ دیتے ہیں کہ فلاں دیوان فلاں شاعر کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ شاعر موصوف تو پیدائشی بلکہ پشتینی جاہل تھے۔ اور آخری دم تک الف کو لٹھ سمجھتے تھے۔ ان کے علاوہ نقادوں کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے جن کے نام کے ساتھ ڈگریوں کا لمبا چوڑا دم چھلا لگا ہوتا ہے۔ اس لئے بعض حلقوں میں ان کی تنقید معتبر سمجھی جاتی ہے (ہم ایسے نقادوں کو بھی غیر معتبر سمجھتے ہیں)

مرزا غالب کے بارے میں نہ صرف جراحِ سخن حضرات بلکہ بعض تُک بند قسم کے شاعر بھی وقفہ وقفہ سے یہ افواہ اُڑاتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اتنی ادق زبان استعمال کی ہے کہ معنی و مفہوم سمجھنے سمجھانے میں تمام موجودہ لغتیں و ڈکشنریاں ناکام رہتی ہیں اور جتنی پرانی لغتیں ہیں ان کا یہ حال ہے کہ ان میں اور دیوانِ غالب میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا بلکہ دونوں ایک دوسرے کی کاربن کاپی معلوم ہوتی ہیں۔۔۔۔ اس شکایت کے باوجود ہم نے مرزا غالب کے کئی مصرعے و اشعار لوگوں کو موقع بے موقع گنگناتے یا کوٹ کرتے دیکھا ہے۔ بلکہ رکشاؤں، لاریوں و دیگر چلتی پھرتی سواریوں کی پشت پر جلی حرفوں میں لکھے ہوئے بھی دیکھے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان مصرعوں یا اشعار میں ہر جگہ دو چار نئے لفظ ضرور نظر آتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کاتبوں کو ایڈیٹنگ کا پورا پورا حق ہوتا ہے بلکہ اتنی بیدردی سے تو اُردو رسالے کا کوئی مدیر کسی نئے شاعر کی

بے بحر بے وزن غزل یا نظم کی ایڈیٹنگ نہیں کر سکتا

مرزا نوشہ کی شاعری کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر مرض کی دوا زندہ طلسمات کی طرح ہر موقع کے لیئے ان کا کوئی نہ کوئی شعر چسپاں ہو جاتا ہے۔ بقول شخصے مرزا کی شاعری عشق، فلسفہ، سیاست، تصوف، طب، تاریخ، جغرافیہ، کیمیا طبعیات غرض تمام فنون بلکہ جنون کی آئینہ دار ہے۔ الیکشن میں ہارے ہوئے کسی لیڈر کا مذاق اڑانا ہو یا تسلی دینا ہو، دونوں صورتوں میں مرزا غالب ہی کا کوئی شعر موزوں ثابت ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شادی بیاہ، چھلّہ، چھٹی، چاہے کوئی بھی تقریب ہو، چچا غالب کے اشعار اس طرح فِٹ ہو جاتے ہیں جیسے انہوں نے صرف ایسی ہی تقاریب کے لیئے شعر کہے ہوں۔۔ اگر کسی کی لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہو تو اخباروں میں لڑکی کی تصویر کے ساتھ مرزا غالب کا کوئی موزوں و بر موقع شعر دیدیا جائے تو لڑکی کے لوٹ آنے کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن شعر کے انتخاب میں اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو پھر لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ یعنی فرار شدہ لڑکی کا لوٹ کر آنا تو دور، گھر کی کسی دوسری لڑکی کے بھاگ جانے کا خطرہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس میں مرزا غالب کا کوئی قصور نہیں ان کی شاعری کا بھی قصور نہیں بلکہ سارا قصور ہے تقدیر کا جس کا گلہ خود چچا غالب نے کچھ یوں کیا ہے ؎ تقدیر کا فسانہ جا کر کسے سنائیں

اس دل میں جل رہی ہیں ارماں کی چتائیں

آپ کہیں گے یہ مرزا غالب کا شعر نہیں بلکہ فلمی گانا ہے۔ مانا یہ فلمی گانا۔ لیکن کیا آپ کوئی ایسا فلمی گانا بتا سکتے ہیں جس کا مضمون دیوانِ غالب سے اڑایا ہوا نہ ہو، یہی نہیں بلکہ مرزا غالب کے بعد جتنے بھی شاعر ہوئے کیا انکی ایک بھی ایسی تخلیق کا حوالہ دے سکتے ہیں جو مرزا غالب کے کسی خیال یا مضمون سے دانستہ یا نادانستہ نہ ٹکرائی ہو، مانا کہ ان شاعروں نے چچا غالب کی

زمین میں شعر نہ کہے ہوں۔ ویسے مرزا غالب کی زمین میں شعر کہنا لوہے کے چنے بلکہ گولے چبانے کے برابر ہے۔ ان کی شاعرانہ زمین اور دیگر شعراء کی زمینوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ان شعراء کی زمینیں زیرِ فلک ہیں جب کہ مرزا غالب کی شاعرانہ زمین وہ زمین ہے کہ فلک جسکے زیرِ سایہ ہے، اب ایسی زمین میں جوکہ آسمان کی بھی آسمان ہو، شعر کہنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے جبکہ مرزا کی کسی صبح کی شام اسوقت تک نہ ہوتی تھی جب تک کہ وہ کم ازکم ایک عدد جوئے شیر نکال نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

غالب نواز اور اینٹی غالب دونوں طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے خیالات، بیانات اور تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کی شہرت میں اینٹی غالب حضرات نے ہی چار چاند لگائے ہیں، جبکہ غالب نواز حضرات اس حد تک غلو کر جاتے ہیں کہ چچا غالب کی شخصیت اگر چٹان کی طرح مضبوط نہ ہوتی تو ان کے متعلق عوام کے خیالات آج قطعی مختلف ہوتے۔ غالب نواز حضرات کی غالب پرستی کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے... ہر اچھے شعر کو مرزا کا بتاتے ہیں، چاہے وہ کسی موجودہ شاعر کا ہو یا اساتذہ میں سے کسی کا اور ایسے تمام نزاعی شعر جو اکثر نامعلوم شعراء سے منسوب کیے جاتے ہیں قسم قسم کی دلیلوں کیساتھ انہیں مرزا کے شعر ثابت کرتے ہیں۔ ایک غالب نواز نے میر کے اس مشہورِ زمانہ شعر ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کے بارے میں فرمایا کہ یہ شعر دراصل چچا غالب کا ہے اور یوں ہے ؎

سرہانے ذوق کے آہستہ بولو
ابھی غالب سے لڑکر سوگیا ہے

غالب اور ذوق کی شاعرانہ چشمک تو زمانہ بھر میں مشہور تھی۔ غالب نے یہ شعر اس تصور کے ساتھ کہا ہے کہ ذوق ان سے لڑنے آئے ہیں، لیکن پہلے ہی راؤنڈ میں "ناک آوٹ" ہوجاتے ہیں اور خفت مٹانے کے لیے سونے کی ایکٹینگ کررہے ہیں۔ جب کہ اینٹی غالب حضرات اور مخالف کیمپ کے شعراء کا خیال ہے کہ غالب کی اس بے انتہا مقبولیت کا سبب ان کے کلام کی خوبی نہیں بلکہ ان پر ریسرچ کرنے والوں کی تعداد ہے جو اتنی زیادہ ہے کہ اگر حساب نکالا جائے تو فی غزل بلکہ فی شعر ایک عدد محقق ضرور نظر آئے گا۔ مخالف کیمپ کے شعراء سے مراد صرف جدید شعراء نہیں بلکہ ہر وہ شاعر ہے جو اپنے کسی شعر پر جی بھر کر خوش ہونے بھی نہیں پاتا کہ کوئی باشعور سامع یہ احساس دلا کر اس کا سارا نشہ کافور کردیتا ہے کہ یہ شعر تو مرزا کے فلاں شعر کا چربہ ہے یہ سن کر شاعر اسقدر چراغ پا ہوجاتا ہے کہ مخالف کیمپ میں پہنچ کر غالب کے خلاف کمر بستہ ہوجاتا ہے، حالانکہ اسے تو کندھے سے بستہ لٹکائے کسی پرائمری اسکول کا رُخ کرنا چاہیئے تھا (یہ اس کے حق میں بہتر ہوتا)

مرزا غالب کو شاعری کے علاوہ خط لکھنے کا بھی خبط تھا، جس کی وجہ سے سنا ہے محکمہ ڈاک و تار کو اس زمانے میں اس قدر فائدہ ہوا کہ ارباب مجاز نے انہیں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے کی پیش کش کی تھی۔ جسے مرزا غالب نے صرف اسی وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس طرح انہیں خط لکھنے کے بجائے صرف خط بانٹنے پڑیں گے۔ انہیں تو بس خط لکھنے کا جنون تھا۔

چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

کان پر قلم رکھ کر گھر سے نکلنے میں جو شان اُس زمانے میں تھی وہ بھلا پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے میں کہاں سے آتی، آخری عمر میں تو سنا ہے ان کا یہ خبط اسقدر بڑھ گیا تھا کہ وہ بے مطلب خط لکھنے لگے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ایک محقق نے مرزا غالب کے اِس خبط کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ بے مطلب خط لکھنے کا سلسلہ جو مرزا نے شروع کیا تھا اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ جدید رنگ میں "بلینک ورس" قسم کی نظمیں کہنا چاہتے تھے۔ لیکن اِس دور کی پابندیوں نے انہیں جکڑ رکھا تھا، لہذا اِس جذبے کی تکمیل کی خاطر وہ بے مطلب خط لکھنے لگے اِس اعتبار سے ان کے خطوط جدید شاعری کی بہترین مثال کہلائے جا سکتے ہیں۔ ان کی اس بے مطلب خط لکھنے کی تحریک نے آگے چل کر ترقی پسند تحریک کی شکل اختیار کی۔ پھر اس نے چولا بدلکر "جدیدیت" کا رُوپ دھار لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب، ترقی پسندوں اور جدیدیوں، دونوں کی آنکھ کے تارے ہیں۔

کہتے ہیں ہر شاعر اپنے ڈھنگ سے شعر کہتا ہے۔ شعر کہنا چونکہ ایک تخلیقی عمل ہے اس لیئے اِسے بچہ جننے کے مترادف سمجھا جاتا ہے اِس اعتبار سے ہر شاعر روز دو چار "ڈلیوریز" کی تکلیف سے ضرور گزرتا ہے البتہ بعض اوقات "ڈلیوری" نارمل ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات "سیزرین" کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہاں تک شاعرات، کا تعلق ہے، شعر کی ڈلیوری، ان کے لیے

کوئی حقیقت نہیں رکھتی کہ یہ "ایکسپریس ڈیلیوری" کی تکلیف سہنے کی عادی ہوتی ہیں۔

مرزا غالب کے شعر کہنے کا طریقہ بالکل مختلف تھا، جب بھی کوئی مضمون غائب سے اِن کے خیال میں آتا وہ فوراً اپنے 'ازار بند' میں گرہ ڈال لیتے اگر کبھی آمد مسلسل ہوئی تو غالباً جتنے پاجامے گھر میں موجود ہوتے (بشمول بیگم صاحبہ کے) پہن لیا کرتے تھے اور پھر فرصت سے بیٹھ کر اِن گرہوں کو کھول کر اِن اشعار کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ ازار بند کی سہولت سے آج کے بیشتر شاعر محروم ہیں کیونکہ پتلون اپنائے ہوئے ہیں۔ تاہم رات کے وقت پاجامہ پہن کر ازار بند کی سہولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے بلکہ اگر کسی کے ہاں پاجامہ نہ بھی ہو تو صرف ازار بند یعنی ناڑا ہی کمر سے باندھ کر اِس سہولت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

مرزا غالب کو میووں میں آم بہت مرغوب تھے۔ اسی لیئے وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، الٹا دوسروں پر رعب جماتے تھے (یہ صرف انہی کی خصوصیت تھی ورنہ اِس دور میں 'آم' والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ صرف دام والے کا سکہ چلتا ہے اور جس کے پاس دام ہے اسکے قبضے میں آم بھی ہے جام بھی اور نام بھی)۔ اِس کے برعکس چچا غالب زندگی بھر بے دام رہے، پھر بھی آم کھاتے، جام لنڈھاتے اور نام کماتے رہے... قربان جایئے چچا کے پاس کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا۔ خود ہی فرماتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جبکہ انہوں نے خود پوچھا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ تو عرض ہے

نہ دیوانِ غالب چھپتا، نہ زبان زدِ خاص و عام ہوتا، نہ آپ انتقال فرماتے اور نہ پورے سو برس بعد آپ کے گڑے مردے کو اکھاڑا جاتا اور نہ یار لوگ آپکو بانس پر چڑھاکر اپنے الو، فاختے، چیل، کوّے وغیرہ سیدھے کرتے۔)

ویسے اگر چچا غالب کو آم کے بجائے 'سیتا پھل' مرغوب ہوتے تو کیا؟ اسی طرح آج شہرت کی بلندی پر ہوتے۔ اس سلسلے میں کسی محقق کو چاہیئے کہ تحقیق کرے اور اپنے اس انوکھے مقالے کا عنوان رکھے۔ "مرزا غالب اور سیتا پھل"۔

مرزا غالب پر، ان کی شاعری پر، یوں تو سبھی نے کرم کیا ہے لیکن پڑھے لکھے ڈگری یافتہ طبقہ نے کچھ ایسا گرما گرم، کرم کیا ہے کہ خود ان کی روح بھی تڑپ کر یہ کہتی ہوگی کہ ہم پر نہ کرم کرتے تو یہ بھی کرم ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سنیئے جس کے متعلق کچھ احباب کا خیال ہے کہ حقیقت ہے لیکن ہمارے لیے چونکہ سنی سنائی ہے اس لیے دروغ برگردنِ راوی (سچ ہے جب بھی دروغ گوئی کی نوبت آتی ہے ہم اردو وال اپنی گردن بچانے کے لیے غریب راوی کی گردن پھنسا دیتے ہیں۔) لطیفہ یوں ہے کہ ایک کالج میں اردو کے لیکچرر کے لیے انٹرویو چل رہا تھا۔ جب ایک امیدوار سے غالب کا کوئی شعر سنانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے یہ مصرع ؎ کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
کچھ اس طرح پڑھا ؎ کاؤ کاؤ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

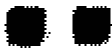
آپ کو غالباً ہنسی آرہی ہوگی لیکن یہ جان کر حیرت سے آپ کا منہ کھلا رہ جائے گا کہ ان ہی امیدوار کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ ان کی خوش بختی کہیئے یا ہونہار طالب علموں کی بدبختی، ہوسکتا ہے انٹرویو لینے والے حضرات کے ذہن میں یہ مصرع کچھ یوں محفوظ ہو ؎

کائیں کائیں سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

چلتے چلتے اتنا اور عرض کیجئے کہ مرزا غالب کا پورا نام، نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب تھا۔ اور وہ عمر بھر قرض کی مئے پیتے رہے۔ اس لئے زندگی بھر مقروض رہے۔ غالباً یہی وجہ ہے جو اس قسم کے القابات و خطابات اب مسدود کر دیئے گئے ہیں تاکہ لوگ نہ قرض کی مئے پیئں اور نہ مقروض ہوں۔

اب آخر میں اس اعتراف کے ساتھ ختم کرتا ہوں یہ مضمون کہ ؎

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" ——————"



امریکہ کا چسکہ

پچھلے کچھ عرصے سے شہر میں ایک نئی وبا پھیلی ہے، جو اس قدر متعدی ہے کہ روزانہ سینکڑوں نوجوان دھڑا دھڑ اس عارضے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ آپ یقیناً اس عارضے کا اسم گرامی جاننا چاہیں گے۔ اس عارضے کا نام ہے "امریکہ" جی ہاں امریکہ یعنی "یو، یس، اے" آج شہر کے ہر نوجوان کو امریکہ کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ یعنی امریکہ جانے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا ہو تو خود پوچھ دیکھئے۔ انشاء اللہ یہی جواب ملے گا... "جی ہاں آپ کی دعا سے بہت جلد امریکہ جا رہا ہوں" گویا انکے لئے امریکہ جانا ایسا ہی ہے جیسے پتھر گٹی سے معظم جاہی مارکٹ جانا، آج کا نوجوان بات بات میں امریکہ کا حوالہ دینا فخر کی بات سمجھتا ہے۔ گویا امریکہ کا ذکر مہذب ہونے کی دلیل ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں خود ہم بھی اس عارضے میں ایک عرصہ تک مبتلا رہ چکے ہیں۔ ویسے بھی مسلسل بے کاری، بے روزگاری سے تنگ آکر آج کا ہر نوجوان یا تو خودکشی کی سوچتا ہے یا امریکہ جانے کی۔ ہم میں چونکہ خودکشی کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لئے امریکہ جانے کی ٹھانی اور پھر اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اور اب سوچتے ہیں خالی ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے ہم نے اگر پاکٹ مارے ہوتے، ڈاکے ڈالے ہوتے تو آج یا تو ایک بہت بڑے بزنس مین ہوتے

یا چنچل گوڑہ کی جیل میں کم از کم دو وقت کی مدھم سوکھی روٹی سے بے فکر ہوتے۔ امریکہ کی طرف روانگی کی مبہم سی خواہش، موہوم سی [illegible] تھی لیکن اس وقت شباب پر پہنچ گئی جب ہمارے پڑوس سے ایک "نان میٹرک" نوجوان امریکہ سدھارے ہم نے سوچا، جب ایک "نان میٹرک" نوجوان امریکہ جا سکتا ہے تو کیا ہماری بی۔ اے کی ڈگری ہمیں امریکہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس روز ہمیں اپنی تھرڈ کلاس ڈگری پر بڑا پیار آیا۔ ہم نے فوراً اُسے صندوق کی قید اور دیمک کے شکنجے سے رہائی دلائی۔ اور پھر ایک خوب صورت فریم میں آویزاں کر کے دالان میں ایک ایسی جگہ لٹکا دی جہاں سے ہر آنے جانے والے کو صاف نظر آسکے۔ اس روز سے ہم اپنے نام کے ساتھ جلی حرفوں میں ڈگری بھی لکھنے لگے۔ اب چونکہ امریکہ کا بھوت اپنے چاروں ہاتھ پاؤں سمیت ہم پر سوار ہو چکا تھا اس لئے ہم نے ضابطے کی سب سے پہلی تکمیل کی خاطر پولیس کے دفتر میں پاسپورٹ کے لئے درخواست دے دی۔ اور پھر اس خوش فہمی کے جھولے میں جھولتے رہے کہ ادھر پاسپورٹ ملا اور اُدھر امریکہ میں آنکھ کھلی۔۔ کچھ روز بعد کا واقعہ ہے، ہم جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے خاندان کے بزرگوں کی قہر آلود نظریں دیکھ کر ہم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ کسی نے فرمایا، کمبخت یہ تو بتا تو خاندان کی ناک کٹوانے پر کیوں تلا ہوا ہے۔ کسی اور نے کچھ یوں لقمہ دیا۔ ہم تو شروع سے کہہ رہے تھے کہ اتنی چھوٹ مت دو آخر بدمعاش لونڈوں کی صحبت کا اثر رنگ لا کر رہا۔ ذرا پوچھئے تو کمبخت سے کہ آخر کہاں نقب لگائی، کہاں ڈاکہ ڈالا ہے جو پولیس والے محلے کے لوگوں سے اسکے چال وچلن کے بارے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ پولیس کا نام سُنکر گھڑی بھر کیلئے ہمارے بھی اوسان خطا ہو گئے، لیکن جیسے ہی یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے پاسپورٹ کے سلسلے میں یہ پوچھ گچھ ہوئی ہو۔ ہم مارے خوشی کے چیخ اٹھے "کیا واقعی"؟

ابے تو۔ تو اسطرح خوش ہو رہا ہے جیسے پولیس والے نہیں، تیری سسرال والے ہوں۔ نامعقول۔ پولیس کا نام سُنکر شریف لوگوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ جواب میں ہم نے

پاسپورٹ والی بات بتا کر ان سب کو مطمئن کرنا چاہا لیکن اگلے وقتوں کے لوگوں کو کوئی مطمئن کر سکا ہے۔ چنانچہ ہم انہیں انکے حال پر چھوڑ کر پولیس کے دفتر کے چکر کاٹنے لگے لیکن خدا بھلا کرے ان پولیس والوں کا ہمیں اور ہماری جیب دونوں کو کافی ہلکا کرنے کے بعد پاسپورٹ ہمارے حوالے کیا۔ پاسپورٹ ہاتھ میں کیا آیا یوں لگا جیسے جنت میں داخلے کا پروانہ ہاتھ آگیا ہو۔ ہم اس بات سے قطعی بے خبر دوست احباب کی مبارکباد وصول کرتے رہے کہ ؎ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ایک شناسا نے فرمایا: "اب آپ کو دُنیا کی کوئی طاقت امریکہ جانے سے نہیں روک سکتی میری مانیئے تو پہلے امریکہ کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کیجئے۔ وہاں کا موسم ماحول رہن سہن غرض زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں معلومات حاصل کیجئے، اس طرح آپ خود کو پہلے ہی سے وہاں کے ماحول کے مطابق ڈھال سکیں گے۔ اور جب وہاں پہنچیں گے تو وہاں کے لوگوں میں یوں گھل مل جائیں گے جیسے دودھ میں پانی" مشورہ چونکہ معقول تھا اسلئے ہم نے فوراً عمل درآمد شروع کر دیا۔ ہر اُس لائبریری کے ممبر بن گئے جہاں امریکن لٹریچر کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ امریکن فلمیں بھی پابندی سے دیکھنے لگے چنانچہ یہ حال ہوگیا کہ روز علی الصبح ہم نہار پیٹ گھر سے نکل جاتے اور مختلف لائبریریوں کا رُخ کرتے ہوئے اس سینما میں پہنچ جاتے جہاں کوئی امریکی فلم چل رہی ہوتی۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا (کم از کم ہمارے حق میں) دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا لب و لہجہ، چال ڈھال حرکات و سکنات غرض ہر انداز "امریکنائیز" ہوگیا۔ اب ہم لائبریریوں اور فلموں کے علاوہ ٹرین اور پلین کے اوقات میں اسٹیشن اور ایرپورٹ بھی جانے لگے تاکہ امریکہ سے آنے والے خوش نصیبوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

ایک امریکہ پلٹ نے انٹرویو کے دوران بتلایا کہ امریکہ میں لڑکیوں کے لئے بڑے اچھے مواقع ہیں۔ معقول مشاہرے والی ملازمتیں بڑی آسانی سے مل جاتی ہیں

یہ جان کر ہمیں زندگی میں پہلی بار اپنے مرد ہونے پر افسوس ہوا۔ ہم نے سوچا کاش ہم لڑکی ہوتے۔ تبدیلیٔ جنس کے کئی واقعات اخباروں میں پڑھ چکے تھے۔ اس لئے کچھ دنوں تک یہی خواہش ہمارے سینے میں پلتی اور بڑھتی رہی کہ کاش ہماری بھی جنس تبدیل ہو جائے۔ لیکن جنس تو تبدیل نہیں ہوئی البتہ ہمارا ٹھکانہ ضرور تبدیل ہو گیا ہمارے کچھ پڑوسیوں نے ہمیں بلا ناغہ ریلوے اسٹیشن پر دیکھ کر سنا ہے والد صاحب سے کچھ یوں ہمدردی ظاہر کی تھی۔ قبلہ معلوم ہوتا ہے آج کل آپ کی مالی حالت بہت خستہ ہے شائد اسی لئے آپ کے فرزند ارجمند اسٹیشن پر قلی کا کام کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ والد صاحب ہمیں "عاق" کرتے ہم خود نانی کے ہاں اٹھ گئے۔۔ امریکہ کا جو بھوت ہمارے سر پر سوار تھا وہ اب ہمارے اندر پوری طرح حلول کر چکا تھا۔ چنانچہ ہمارا جنون اس ڈگری کو پہنچ گیا کہ جہاں کہیں جس کسی کی زبانِ مبارک سے لفظ "امریکہ" نکلتا ہم دوڑ کر اس تک پہنچ جاتے۔ کئی بار تو دوڑتی ہوئی سواریوں کی زبانی لفظِ امریکہ سن کر بسوں، موٹروں و دیگر تیز رفتار سواریوں کی پرواہ کے بغیر اس مخصوص سواری کے پیچھے دوڑنے کی کوشش میں اپنے ہاتھ پاؤں سرکا چکے ہیں۔

ہمارے اس پاگل پن پر ایک کرم فرما کو رحم آگیا۔ انہوں نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ امریکہ سے آنے والوں کے بجائے، جانے والوں سے ربط بڑھایئے۔ پھر کیا تھا شہر سے نکلنے والا ہر اخبار بلا ناغہ دیکھنے لگے۔ ہر روز کسی نہ کسی کے امریکہ جانے کی خبر معہ تصویر کے ضرور نظر سے گزرتی۔ اور ہم سر کے بل دوڑتے ہوئے تصویریں اس خوش نصیب تک پہنچ جاتے لیکن ہماری یہ بھاگ دوڑ اکثر بے سود ثابت ہوتی کیونکہ صاحبِ موصوف وقت سے پہلے ہی امریکہ پہنچ چکے ہوتے اس لئے ایسی حقیر نظروں سے ہماری طرف دیکھتے جیسے انہیں ہمارے انسان ہونے میں شبہ ہو۔

ان ہی دنوں جیسے ہی یہ بھنک ہمارے کان میں پڑی کہ ہمارے وہی ہم محلہ

نوجوان امریکہ سدھار رہے ہیں۔ جنھیں سلام کے سلسلہ میں ہم صرف اس لئے یہیں نہیں کرتے کہ ان کے والد ہمارے اسکول میں چپراسی رہ چکے تھے۔ ہم ڈور کر ان کے ہاں پہنچے، اور پھر نہ صرف جھک کر کئی عدد فرشی سلام کئے بلکہ ان سے بغلگیر ہو گئے اور پھر اُن سے کچھ اتنا ربط بڑھایا کہ دو چار دن میں ہی لوگ ہمیں اُن کا باڈی گارڈ سمجھنے لگے۔ ہر ملاقات کے دوران، ان کے والد صاحب کی شان میں قصیدے بھی پڑھتے "جاہل زمانہ صرف ڈگریوں سے قابلیت پرکھتا ہے۔ اور آپ کے والد صاحب کے پاس صرف ڈگریوں کی کمی تھی۔ ورنہ صورت شکل اور رکھ رکھاؤ سے تو وہ ہیڈ ماسٹر پرنسپل بلکہ وائس چانسلر معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے پاسپورٹ کی کاروائی بھی ہمارے ہی ہاتھوں مکمل ہوئی۔ ساری دوڑ دھوپ ہم نے کی، اور انہیں آرام سے گھر پر بٹھائے رکھا۔ ویزا کے سلسلے میں ہم ان کے ہمراہ مدراس بھی گئے۔ بلکہ آنے جانے کا کرایہ، قیام و طعام کے اخراجات ہم نے ہی برداشت کئے۔ اور پھر انہیں رخصت کرنے کے لئے جہاں ان کے رشتہ دار، دوست احباب صرف نامپلی اسٹیشن تک آئے ہم ان کے ساتھ بمبئی تک گئے۔ اور جب تک ان کا جہاز ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ ہم اپنے دونوں ہاتھ بلکہ سارے جسم کو ہلاتے رہے۔ انہوں نے ہمارا ویزا بھیجنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے صرف خود کو ہلانا کیا معنی، وہ کہتے تو ہم زمین آسمان ہر شئے کو ہلا کر رکھ دیتے۔

لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے نام جو معمولی ٹرنر تھا ویزا، اور ہمارے نام ایک معمولی سا خط بھیج کر ہماری دماغ کی ساری چولیں ہلا ڈالیں، لکھا تھا۔ امریکہ میں آجکل ہنرمندوں کی بڑی قدر ہے۔ ہو سکے تو آپ بھی کوئی ہنر سیکھ لیجئے۔ چنانچہ ان کے مخلصانہ مشورے پر ہم نے نہ صرف ٹرنر کا کورس سیکھنا شروع کیا بلکہ شہر کے مختلف فنی اداروں میں جتنے بھی ٹیکنیکل کورس سکھلائے جارہے تھے سب

سیکھنے لگے، نتیجتہً ایک قلیل مدت میں ٹرنر، فیٹر، وائرمین، ریفریجریشن، ویلڈر، کمپیوٹر وغیرہ کے سرٹیفیکیٹ مختلف چھوٹے بڑے فریموں میں آویزاں ہماری بی اے کی ڈگری کے اطراف لٹک گئے۔

ہمارے لئے سب سے بڑی رکاوٹ "Sponsor ship" کا مسئلہ تھا۔ اور ایرے غیرے نتھو خیرے بھلا ہمارے لئے اتنا بڑا جوکھم کیوں مول لیتے، اب رہے رشتہ دار تو وہ سب کے سب مویشیوں کی طرح ایک ہی تھان میں رہنے کے قائل تھے۔ ترکِ وطن تو دور کی بات محلّہ تک بدلنا گناہ سمجھتے تھے۔ اب یہ سوچنا تو فضول تھا کہ کاش ہماری کوئی خالہ، پھوپھی یا بہن ہی امریکہ میں بیاہی گئی ہوتی۔
انہی دِنوں ایک دوست کے توسط سے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ رشتہ جوڑنے اور توڑنے کے فن میں ماہر ہیں۔ جب انھیں ہماری مجبوری کا علم ہوا تو بولے۔ جی نہ چھوٹا کیجئے برخوردار۔ کیا ہوا جو امریکہ میں آپکے کوئی رشتہ دار نہیں ہیں۔ نئے رشتے تو دنیا کے ہر کونے میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ ہم انکا اشارہ سمجھ گئے۔ لہذا اپنی ہچکولے کھاتی ہوئی "ناؤ" اِس ناخدا کے حوالے کر دی۔ اور پھر ایک دن خاندان کی خوبصورت پڑھی لکھی، سمجھ دار، سلیقہ مند لڑکیوں کے ہوتے ہوئے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف ایک نک چڑھی، کرخت مزاج، پھوہڑ لڑکی کو اپنی بیوی کے روپ میں گھر لے آئے۔ صرف اس لئے کہ اُسکی بڑی بہن اور بہنوائی امریکہ میں رہتے تھے اور ہمیں فوراً امریکہ بلانے کا وعدہ کیا تھا اپنی پھوہڑ بیوی کو ہم امریکہ جانے کا ویزا سمجھتے تھے۔ اِس لئے اسکا ہر عیب ہمیں ہنر نظر آتا تھا۔ اِن ہی چاؤ چونچلوں میں جب دو چار مہینے نکل گئے تو ہم نے یاد دہانی کے طور پر اپنے ہم زلف کو خط لکھا۔ جس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ فی الوقت امریکہ میں بے روزگاری چل رہی ہے اس لئے کچھ دِن انتظار کیجئے۔ اس انتظار کے دوران

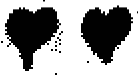
ہم بھی ایک سے دو ہو چکے تھے تین ہو گئے۔ پھر انہیں یاد دہانی کا خط لکھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ ویت نام کی جنگ کی وجہ سے یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ تھوڑا سا انتظار اور کیجئے۔

اس انتظار کے دوران ہمارے ہاں ایک اور نیا مہمان چلا آیا۔ ہم نے پھر ایک بار خط لکھ مارا۔ جس کے جواب میں انہوں نے ہمیں ایسا لاجواب کیا کہ آج تک ہم اس کا جواب نہ دے سکے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ جو فوجی آج نہیں تو کل مورچے سے لوٹیں گے انکے لئے روزگار فراہم کرنا خود امریکہ کے لئے ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ کم از کم دس پندرہ سال تک لوگوں کو امریکہ کے متعلق کچھ سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔ میں خود وطن واپس لوٹنے کی سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں

اس دوران میں ہماری مالی حالت بیٹھ بلکہ لیٹ چکی تھی۔ والدین اور رشتہ دار بھی کب تک مدد کرتے۔ اور پھر ہماری فیملی بھی گورنمنٹ کے منظور شدہ کوٹے سے تجاوز کر چکی تھی۔ لہذا جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر لے سنگ (تیرا ہی سنگ آستاں) کیوں ہو۔ یعنی امریکہ ہی کیوں۔ سر تو یہاں وطن میں بھی پھوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن امریکہ کے چکر میں ہماری عمر اتنی ہو چکی تھی کہ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے۔ اب رہا خاندانی کاروبار تو اس میں ہم نے شروع سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اب کیا خاک سنبھال سکتے تھے۔ الٹا سولہ سو کے ہزار کر کے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مار دیتے لیکن کوئی نہ کوئی دھندہ کرنا ہی تھا۔ اسی لئے سوچا کہ کیوں نہ ایسا دھندہ شروع کریں جس کا خود ہمیں بھی تجربہ ہو۔ چنانچہ نامپلی اسٹیشن کے قریب فٹ پاتھ پر پھولوں کی ایک چلتی پھرتی دوکان کھول لی۔ امریکہ جانے آنے والوں کی خدمت میں اتنے پھولوں کے ہار پیش کر چکے تھے کہ پھولوں کے بارے میں ہمیں خاصہ تجربہ ہو چکا تھا۔ دوکان پر ایک تختی بھی لٹکالی۔ جس پر جلی حرفوں میں یہ تحریر لکھی تھی۔

مہرباں ایک نظر ادھر بھی!

امریکہ جانے والے حضرات
خصوصاً پہلی بار جانے والے
نوجوان مناسب معاوضے کے
عوض ایک ایسے تجربہ کار ٹیوٹر
کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں جو
امریکہ پر اتھارٹی ہے۔





اس مضمون کے تمام کردار، مقامات اور واقعات اصلی ہیں۔ اگر کسی نے فرضی ثابت کئے تو قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پڑوس میں کسی کے ہاں پارٹی تھی، جس کے متعلق ہمارے دوست جو ہمارے میزبان بھی تھے صبح ہی سے نت نئے انکشافات کر رہے تھے فرمایا۔" ذرا اُس پارٹی کا تصور تو کیجئے جس کے پیچھے ایک ساتھ کئی خوشیاں کارفرما ہیں۔ ایک تو صاحب خانہ کی "بے بی" کا جنم دن ہے، اور غالباً اِس بار بھی انیسویں سالگرہ ہی ہوگی جو پچھلے دو برس سے انتہائی پابندی کے ساتھ منائی جا رہی ہے۔ اور آثار بتاتے ہیں کہ اگلے دو چار برس تک بھی انیسویں ہی سالگرہ منائی جاتی رہے گی۔ بہر حال واللہ عالم ... دوسرے صاحب خانہ کے بڑے صاحب زادے کے بارے میں سنا ہے کہ بی۔ اے کے تین سالہ ڈگری کورس کو پانچ اقساط میں مکمل کر کے برخوردار نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے، تیسرے اِن کے چھوٹے صاحبزادے کا جشنِ صحت ہے اور چوتھے . . . . ."

"اس سے پہلے کہ وہ چوتھا سبب بیان کرتے ہم نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یوں کہیئے اُن کے ہاں "پارٹی" نہیں بلکہ "پارٹیاں" ہیں . . . ."

شام میں جس وقت ہم اپنے دوست اور اُنکی بیوی کے ہمراہ پارٹی میں پہنچے بھانت بھانت کے نمونے اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اور سب کے سب دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تو کسی کو کپڑوں نے پہن رکھا تھا۔ خواتین کی سج دھج

دیکھ کر ہمارے چودہ بلکہ اکیس طبق روشن ہو گئے۔ بدن سے لپٹے ہوئے لباس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کافی ہاتھا پائی کے بعد اسے زیب تن کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں چہرے پر رنگ برنگے میک اپ کی کچھ اتنی تہیں جمی ہوئی تھیں کہ صحیح عمر کا اندازہ لگانا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ویسے بھی الٹرا ماڈرن خواتین کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا بڑے دل گردے کا کام ہے بلکہ اس کوشش میں تو سنا ہے کہ اب تک کئی اہلِ دل و گردہ نہ صرف اپنے دل گردے بلکہ دوسرے کئی ضروری اور اہم ترین اعضاء سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ سب کی سب ایک جیسی ہم عمر نظر آرہی تھیں۔ اور یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں کون ماں ہے کون بیٹی کون ساس ہے، کون بہو۔۔۔؟

"ایک طرف الٹرا ماڈرن نوجوان نسل اپنے اپنے ویڈ ھ اینڈ کے کلب بنائے چہلیں کرنے میں مگن تھی۔ ان میں یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ کون لڑکی ہے کون لڑکا؟ یعنی من و تو کا فرق یکسر مٹ چکا تھا ان سب نے کم خرچ بالا نشین، قسم کا لباس پہن رکھا تھا لگتا ہے آج کے بیشتر ماڈرن نوجوان کپڑوں کے قحط کا زبردست شکار ہیں۔۔۔"

"ہال کے وسط میں ایک بڑی سی میز پر ایک چھوٹا سا کیک رکھا ہوا تھا جس پر دائرے کی شکل میں موم بتیاں تو بہت سجی ہوئی تھیں لیکن صرف ایک ہی جل رہی تھی۔ کیک کو دیکھ کر بہت سارے بچوں اور ایسے بوڑھوں کے منہ سے پانی ٹپک رہا تھا جو ذہنی طور پر خود کو بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ پانی کی مقدار کو دیکھتے ہوئے بارش ہو رہی تھی کہنا بجا ہوگا اور اس بارش سے بچنے کے لئے لوگ صاحبِ خانہ سے بار بار کیک کٹوانے کی گزارش کر رہے تھے بعض اصحاب کو غالباً یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ یہ بارش کہیں طوفان کی شکل نہ اختیار کرلے جب اصرار بہت بڑھ گیا تو صاحبِ خانہ نے یہ کہہ کر دلاسہ دیا کہ بس ابھی کٹ جاتا ہے کیک اِک ذرا چھری آنے کی دیر ہے، جواب میں ایک ادھیڑ عمر کے خوش پوشاک صاحب نے ایک عدد نئی چمکتی ہوئی چھری پیش کر دی۔ ان کے بارے میں ہمارے دوست نے بتلایا کہ اس علاقے

کے شہود سوشیل ورکر ہیں، کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیشہ چھری کانٹے لیے رہتے ہیں۔۔۔ چھری دیکھ کر لوگ سنبھل گئے۔ پھر کسی نے اعلان کیا کہ "بے بی" تشریف لا رہی ہیں کچھ توقف کے بعد سامنے والا پردہ ہٹا۔ اور ایک "بابا" نمودار ہوا۔ لوگوں نے تالیاں اور ہم نے بغلیں بجائیں۔ کیا یہی "بے بی" ہے" ہم نے اپنے دوست سے بڑی آہستگی سے پوچھا۔۔۔

"جی ہاں۔ وہ بھی اسی آہستگی سے بولے۔" اسی بابا کو لوگ "بے بی" کہتے ہیں ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعی لڑکی ہے۔۔۔۔۔"

"بے بی چھری سنبھال چکی تھیں۔ لیکن موم بتیوں کی تعداد کو دیکھ کر بے بی کا پارہ اس قدر چڑھ گیا کہ اس نے چھری سمیت ایک قریبی نوجوان پر دھاوا بول دیا۔ اگر لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو کیک کی جگہ وہ نوجوان کٹ چکا ہوتا۔ اور پھر بے بی جیل میں۔ نوجوان ہسپتال یا قبرستان میں اور سارے مدعوئین گواہی کے سلسلے میں عدالت کے پھیر میں ہوتے۔۔۔" بے بی کی اس قاتلانہ حرکت کا سبب دراصل موم بتیوں کی تعداد تھی۔ کسی نے شرارتاً کیک پر انیس کی جگہ اکیس موم بتیاں سجا دی تھیں۔ اور سچائی کو یوں بے نقاب دیکھ کر "بے بی" آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔ خیر حضور کیک کٹ گیا، کٹ کر بٹ گیا، تحائف کی موسلا دھار بارش برس کر تھم گئی اور بے بی جو اب تک سب کی مرکز توجہ تھیں ان کی جگہ صاحب خانہ کے چھوٹے صاحب زادے نے لے لی۔ جن کے بارے میں بتلایا گیا تھا کہ لمبی بیماری کے بعد صحت یاب ہوئے ہیں۔ بیماری کے بعد بھی برخوردار کی صحت اس قدر قابلِ رشک تھی کہ ہم نے دل ہی دل میں یہ دعا مانگی اے بیماریوں کے بخشنے والے ایک نظر کرم ادھر بھی ہو جائے اور اگر اسی بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو کیا کہنے۔ صاحب زادے کی گل پوشی کے بعد کسی نے اعلان کیا کہ فلاں ڈاکٹر صاحب صحت کے اصولوں پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ ایک صاحب فوراً مین فیوز (Main Fuse) کی جانب بڑھے، کسی نے مداخلت کی۔ اماں کیا کرتے ہو، بولے "فیوز" آف کرتا ہوں۔ تاکہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی روشنی میں اپنی صحت کا

ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکوں۔ دوسرے صاحب بولے اگر آپ روشنی گل کر دیں گے تو ڈاکٹر صاحب کی صحت کا اندازہ لگانا مشکل ہو جائے گا۔" اس جملے نے گویا جادو کا اثر دکھایا اور وہ صاحب اپنے خطرناک ارادے سے باز آگئے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر گرچہ مختصر تھی لیکن تھی بڑی معرکہ خیز، بلکہ حیرت انگیز موصوف نے بنی نوع انسان کی جسمانی ساخت کا موازنہ مختلف النوع جانوروں، جیسے بھینس، بکری، گھوڑا، گدھا وغیرہ سے کرتے ہوئے چند ایسے نکات بیان فرمائے جسے جاننے کے بعد غالباً ہر فرد نے یہی سوچا ہوگا، کاش وہ انسان نہیں بلکہ بھینس، بکری، گھوڑا، گدھا ہوتا، المختصر حیوان ظریف نہیں صرف حیوان ہوتا۔ ہم نے تحسین آمیز نظروں سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر سوچا۔ بے چارے انسان ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر جانوروں سے کس قدر قریب ہیں۔" بعد میں پتہ چلا کہ موصوف دراصل حیوانات کے ڈاکٹر تھے۔ اور چونکہ پارٹی میں کوئی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس شریک نہیں تھے اس لیے حیوانات کے ڈاکٹر کی موجودگی کو ہی غنیمت سمجھا گیا۔۔۔!!!

"کیک کٹ چکا تھا۔ گلپوشی ہو چکی تھی، تقریر بھی ہو چکی تھی۔ اب نمبر تھا ناچ گانے یعنی اصلی ہنگامے کا۔ سازندوں کے لیے ایک کونا خالی کر دیا گیا جس کی خانہ پُری کرنے کے بعد سُر ملانے کی غرض سے ان لوگوں نے ایک ایسا لرزہ خیز راگ چھیڑ دیا جسے سن کر یہ گمان ہونے لگا جیسے پہلا صُور پھونکا جا رہا ہے۔ اب تک سنتے آئے تھے کہ موسیقی روح کی غذا ہوتی ہے اگر یہ دِل دہلانے والی موسیقی بھی روح کی غذا کہلاتی ہے تو پھر روح کے ہاضمے کا خدا ہی حافظ! اُدھر گت تیز سے تیز تر ہو رہی تھی اِدھر سب کے کانوں کی گت بن رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک منحنی الجثہ نوجوان جسے نوجوان کہنا نوجوانی کی توہین ہوگی آگے بڑھا اور اپنا سارا جسم یوں تھرکانے لگا جیسے کوئی شدید قسم کا دورہ پڑا ہو۔ کوئی پندرہ منٹ تک اپنے جسم کے ہر عضو کو تھرکانے کے بعد ہانپتا کانپتا بے حال سا ہال سے باہر نکل گیا۔ لوگوں نے تالیوں سے چھت سر پر اٹھا لیا۔ اِس کارِ خیر میں ایک باریش بزرگ بھی پیش پیش تھے، ہم نے

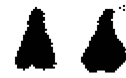
اُن سے پوچھا، قبلہ آپ اُس نوجوان کو جانتے ہیں۔ وہ بولے، یہ بھی خوب کہی اماں وہ تو اپنا ہی نورِ نظر لختِ جگر وغیرہ وغیرہ ہے۔ ان بزرگوار کے بارے میں ہمارے دوست نے بتلایا کہ مقامی یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اخلاقیات ہیں ...... ہم نے گڑبڑا کر کہا "کیا واقعی مجھے تو یہ صدر شعبۂ انگریزی و فرانسیسی لگتے ہیں، میرے خیال میں انہوں نے اولاد پیدا نہیں کی بلکہ یورپ و امریکہ سے امپورٹ کی ہے۔ اندر کے ہنگاموں سے بیزار ہو کر ہم کچھ دیر کے لئے باہر گیلری میں چلے آئے وہ منحنی الجثہ نوجوان بھی وہیں تھا، ہم نے جھٹ اُسے مبارکباد دے ڈالی۔ واللہ برخوردار تم نے تو کمال کر ڈالا، اپنے فن کا اسقدر شاندار مظاہرہ کیا ہے کہ زمین لرز گئی، آسمان دہل اٹھا۔ ویسے کیا آپ کے والد صاحب بقیدِ حیات ہیں ......"

"اجی قید میں ہوں اُن کے دشمن" نوجوان نے کسی لڑاکا عورت کی طرح تنک کر کہا۔ "وہ کیوں بقیدِ حیات ہونے لگے وہ تو ابھی تک بہ فضلِ تعالیٰ شریکِ حیات ہیں ..." برخوردار کا یہ عدیم المثال جواب سنکر ہمیں ان کی اندر انکے گھر کی اُردو کا اندازہ ہو گیا ..."

"جس وقت ہم دوبارہ اندر ہال میں داخل ہوئے ایک صاحب کوئی کلاسیکل قسم کا انگریزی گیت سنا رہے تھے، آواز کی نزاکت سے پتہ چلا کہ وہ صاحب نہیں بلکہ صاحبہ ہیں۔" ان کے بعد ایک کمسن نوجوان نے چچا غالب کی ایک غزل سنائی جس کے ہر مصرع پر لوگ بُری طرح سر دھنتے اور ہم پیٹتے رہے۔ نوجوان غالباً اُردو سے نابلد تھے ان کی زبانی یہ غزل سنکر یوں لگا جیسے چچا غالب نے یہ غزل خالص انگریزی میں وہ بھی انگلستان جا کر کہی ہے۔ اس ہنگامہ خیز غزل کے بعد نیم کلاسکی موسیقی کا دور شروع ہوا۔ جس کے آغاز ہی میں ہم نے چاہا کہ کسی نیم کے درخت پر چڑھ جائیں لیکن قریب میں چونکہ کوئی نیم کا درخت تھا نہیں اس لئے قریبی کھڑکی کو نیم کے درخت کا نعم البدل سمجھ کر اس کی سلاخوں سے لٹکنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دو مختلف گروپ کے آپس میں بھڑ جانے کی وجہ سے پارٹی کو قبل از وقت یعنی

علی الصبح ساڑھے پانچ بجے برخاست کر دیا گیا۔ اب اپنے اپنے جوتوں و چپلوں کی تلاش شروع ہو گئی، دروازے کے پاس جوتوں و چپلوں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ بلکہ ڈھیر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جوتوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا اور اس پہاڑ کو کھود کر اپنا جوتا یعنی جوتا ڈھونڈ نکالنا کم از کم ہمارے حق میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔۔ یہی شور سنائی دے رہا تھا۔۔۔ "میرا جوتا، میری سینڈل، میری چپل، میری ٹانگ"۔ اس آخری آواز پر ہم نے اپنے جوتے کی تلاش کو بالائے طاق رکھ کر اُس جانب دیکھا۔ ایک صاحب اپنی اکلوتی ٹانگ پر یوں اُچک رہے تھے جیسے لنگڑی کھیل رہے ہوں۔ اُن سے استفسار پر پتہ چلا کہ وہ اپنی مصنوعی ٹانگ دروازے کی آڑ میں رکھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے تھے اور اب لوٹ کر دیکھتے ہیں تو ٹانگ ندارد۔۔۔ اُن کی مصنوعی ٹانگ کی تلاش میں کئی عدد اصلی ٹانگیں حرکت میں آ گئیں۔۔۔۔۔

"گھر لوٹتے ہوئے ہمارے دوست اور ان کی بیوی نے پارٹی کے متعلق اپنا متفقہ فیصلہ صادر فرمایا کہ پارٹی بہر حال پائے کی تھی، جسے ہم نے کچھ یوں پایۂ تکمیل کو پہنچایا کہ پارٹی کے ہنگاموں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پارٹی "چوپائے" قسم کی تھی۔۔۔۔۔۔" !!!



عید کے ہنگامے

یوں تو رمضان کی عید (OFFICIALLY) اُنتیس یا تیس روزوں کے بعد شوال کی پہلی تاریخ کو صرف ایک روز منائی جاتی ہے، لیکن غیر سرکاری طور پر مسلمانوں کی اکثریت رمضان کی پہلی تاریخ سے ہی عید منانا شروع کر دیتی ہے اور ان کی اس خوشی کو دو بالا بلکہ چو بالا کرنے کی غرض سے شہر کے تمام چھوٹے بڑے ہوٹل و بھٹیار خانے، خوانچے و ٹھیلے والے رمضان کے خاص تحفے جیسے حیدر آبادی حلیم، ہریس، دہی بڑے وغیرہ تیار کرتے ہیں، بس رمضان کا پورا پورا فائدہ اٹھائیے اور صحت بنائیے۔

کسی زمانے میں کہا جاتا تھا کہ اصل عید روزہ دار کی، لیکن اب چونکہ زمانہ بدل چکا ہے اس لئے عید پر روزہ دار سے زیادہ وہ لوگ اپنا حق جتاتے ہیں جن کے لئے ایک عام مہینے اور رمضان میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک عام مہینے میں تو صرف تین بار پیٹ پوجا کی جاتی ہے، لیکن رمضان میں سحری و افطار کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

یوں تو عید کا انتظار سبھی کرتے ہیں لیکن بعض انتظار پسند حضرات تو اگلی

عید کا انتظار پچھلی عید سے ہی شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک پڑوسی ہیں جنکی صحت رمضان کے دوران کچھ اور جاندار ہو جاتی ہے۔ عید کے دوسرے ہی دن یہ شعر گنگنانے لگتے ہیں ۔

عید کا ایک دن معین ہے ⁂ نیند کیوں سال بھر نہیں آتی

عید اور چاند میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر چاند نہ دکھائی دے تو عید نہیں ہوتی، جس طرح ایک الٹرا ماڈرن محبوبہ کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں اسی طرح عید کے چاند کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ کبھی تو یہ انتیس (۲۹) کی شب کو ہی دھان پان شکل میں نمودار ہو جاتا ہے تو کبھی تیس (۳۰) کی شب کو بھی مطلع سے یوں غائب رہتا ہے جس طرح دھوبی کے ہاں سے لوٹی ہوئی قمیص کے بٹن ۔ ــــــــ ویسے عام دنوں میں اس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن عید کے موقع پر ایک زمانہ اس کی راہوں میں آنکھیں بچھاتا ہے۔ انتیسویں سحری کے بعد سے ہی لوگوں میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ بعض نظر باز تو صبح ہی سے آسمان کی طرف نظریں گاڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے بے چینی کی یہ لہر اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ لوگ خود دوڑنے لگتے ہیں سر کے بل، ہر ایک کی زبان پر یہی سوال ہوتا ہے ۔ کیا چاند نظر آیا؟ خوش قسمتی سے مطلع صاف ہوا، اور چاند نظر آ گیا تو سمجھئے میدان مار لیا۔ فوراً ہی ایک دوسرے سے گلے مل کر عید کا چلتا پھرتا اشتہار بن گئے اس گلے ملنے پر یاد آیا کہ بعض اوقات ایسے موقعوں پر بڑی ہی سنگین غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ بہر دست ایسی ہی ایک سنگین غلطی کی رنگین داستان سنئے۔

ایک صاحب مشترکہ چھت پر کھڑے چاند کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے جیسے ہی چاند نظر آیا خوشی سے اس قدر بے قابو ہوئے کہ پاس ہی کھڑی ایک کیم شحیم خاتون کے گلے سے لگ گئے۔ وہ ان کے پڑوسی فضل دین پہلوان کی بیوی تھیں پھر تو چاند کے ساتھ سرِ شام کئی تارے نظر آ گئے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند میاں عوام الناس کی بے چینی سے محظوظ ہونے کے لئے انتیس کی شب نمودار ہی نہیں ہوتے۔ اور جب وقت ٹل جاتا ہے تو لوگ آسمان سے نظریں ہٹا کر اپنے اپنے ریڈیو "آن" کر کے اس کے اسکرین کو کچھ یوں گھورنے لگتے ہیں جیسے چاند آج اس اسکرین پر نمودار ہونے والا ہو۔ ویسے ریڈیو کی خبر کو سب مستند نہیں مانتے۔ ایسے موقعوں پر عید کا دارومدار مقامی مفتیوں کی 'ہاں' یا 'نا' پر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے طرح طرح کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے.. عید منائی جائے.. تو کوئی کہتا ہے جس مقام پر چاند نظر آیا ہے وہ ہمارے ملک کی سرحد کے اس پار ہے جہاں ہمارا جھنڈا نہیں لہراتا، جو ہماری آزادی کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر ہم ان کے چاند کو کیسے تسلیم کریں۔ اور عوام ان کی اس ہاں اور نا کے مخمصے میں پھنسے، کیا مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر والی کیفیت سے دوچار کسی کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ہواؤں کے دوش پر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ڈولتے رہتے ہیں۔ البتہ شعراء حضرات اور اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے افراد اس شکنجے سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ آسمان کے چاند کو چاند ہی نہیں مانتے۔ ان کا چاند تو دن رات کی قید سے بے نیاز ہوتا ہے۔ جب جی چاہا کسی نہ کسی بہانے اپنے چاند کی جھلک دیکھ لی۔ ویسے عید کے موضوع پر شاعروں نے شعروں کے روپ میں بے حساب ذو معنی قسم کے شوشے چھوڑے ہیں۔ لیکن سبھی نے جانے کس مصلحت کے تحت ضروری احتیاطی تدابیر کا خانہ خالی چھوڑا ہے۔ اس لئے اکثر اوقات ان اشعار کے استعمال پر لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت اس نوجوان کی یاد آرہی ہے، جس سے ایسی ہی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اُس برس بھی شاید انتیس کی شب چاند نظر نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ بے چارا اس غم کو غلط کرنے کیلئے

بھرے مجمع میں یہ شعر دہرا رہا تھا۔ ؎

ہلالِ عید کا کیا ہے دکھا دکھا نہ دکھا
تم ہی نقاب اُلٹ دو کہ عید ہو جائے

اب اس کی کم بختی کہیے کہ پاس کھڑی ہوئی ایک برقع پوش خاتون بھتّے سے اکھڑ گئیں۔ اور نقاب اُلٹ کر اپنے بھرے بھرے چہرے کی نمائش کرتے ہوئے وہ واویلا مچایا کہ آنِ واحد میں ایک خدائی فوجدار نے اس غریب نوجوان کو ٹھوک بجا کے رکھ دیا۔

کہتے ہیں کہ دُنیا وہ عبرت گاہ ہے جہاں ایک کی خوشی سے دوسرے کا غم بنا ہے۔ چنانچہ جس تاریخ کو چاند کے نظر آنے سے جہاں ایک طبقے کی خوشیوں پر ایک دن کے لئے اوس پڑ جاتی ہے وہیں اِن اصحاب کے ولولوں میں کچھ اور جان پڑ جاتی ہے جو عید منانے کے لئے اُدھار، قرض، چوری ڈاکہ ہر حربہ آزمانے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ اِس بہانے انہیں ایک روز اور مقدر آزمانے کا موقع مل جاتا ہے وہ اور بھی شد و مد کے ساتھ بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔۔!!!

جیسے جیسے عید قریب آتی ہے بازاروں کی رونق میں اضافہ ہونے لگتا ہے مستقل دکانوں کے علاوہ چلتی پھرتی فٹ پاتھی قسم کی دکانوں کی تعداد میں اسقدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ چوڑی چکلی شاہراہیں بھی تنگ جگہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ گاہکوں کی سہولت کے لئے دکانیں رات کے پچھلے پہر تک کھلی رہتی ہیں اور عید سے دو چار روز پہلے تو یہ پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ دن یا رات کے کسی بھی حصے میں کسی بھی دکان میں چلے جائیے اور اپنی مطلوبہ اشیاء سے لدے پھندے لوٹ آئیے البتہ بھیڑ بھاڑ کے عالم میں اپنے پاکٹ اور بٹوؤں کا خاص طور سے خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ عید کی خوشیوں پر صرف گاہکوں اور دکانداروں کا ہی حق نہیں ہوتا

بلکہ جیب کترنوں، اُٹھائی گیروں اور گرہ کٹوں کا بھی اتنا ہی حق ہوتا ہے اور یہ حضرات دوسروں کی خوشیوں کو ماتم میں بدل دینا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُس شخص کا اُداس چہرہ ابھی تک یاد ہے جو ایسے ہی بھیڑ بھاڑ کے عالم میں مدینہ بلڈنگ کے فٹ پاتھ پر ایک کھمبے سے لپٹا رونے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ جب ہم نے اِس سے اِس کا سبب پوچھا تو وہ بہ ہزار دقت بڑے ہی رقت آمیز لہجہ میں بولا۔ کیا بتاؤں میں تقدیر کا مارا بڑی دوڑ دھوپ کے بعد چند روپوں کا بندوبست کر سکا تھا۔ تاکہ بچوں کے ہی کم از کم ایک ایک جوڑا کپڑوں کا بن جائے۔ لیکن ہائے۔ اس کم بخت کو کل کی عید دیکھنی نصیب نہ ہو جو یہیں اِسی کھمبے کے پاس لپک کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں سمجھا شاید کوئی پرانا شناسا ہوگا جس کی شکل میرے ذہن سے اُتر گئی ہے۔ اور شاید پیشگی عید کی مبارک باد دے رہا ہے۔۔ مگر گلے ملنا تو بس ایک بہانہ تھا۔ کم بخت میرے بٹوے پر ہاتھ صاف کر کے چلتا بنا!

چاند نظر آنے کے بعد تو بھیڑ بھاڑ اور بڑھ جاتی ہے۔ لوگ ٹکڑیوں کی شکل میں خریداری کو آخری ٹچس (Touches) دینے کیلئے شہر کے تمام بارونق بازاروں کی طرف دوڑتے ہیں۔ کچھ اصحاب ایسے بھی ہوتے ہیں جو روزوں کو سنت اور عید کو فرض مانتے ہیں۔ اور اس فرض کو بجالانے یعنی عید منانے کیلئے جب تک کہ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی کوئی نہ کوئی نادر و نایاب چیز فروخت نہ کرلیں دیگر اشیاء کی خریدی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اِس لئے ایسے اصحاب پہلے تو معمول کے مطابق لنگر ارحوض کا رُخ کرتے ہیں پھر خریدی کی غرض سے پتھر گٹی ہی جانب آتے ہیں۔

جہاں تک ملبوسات کا تعلق ہے، ایسے اصحاب جنھیں ریڈی میڈ کپڑے پہننے کی عادت ہوتی ہے یا جن کی کوشش آخری وقت بار آور ہوتی ہے۔ وہی ریڈی میڈ ملبوسات کی دوکانوں کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ورنہ کپڑوں کی خریداری

کا مرحلہ تو دِنوں پہلے ہی سر کر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ڈر لگا ہوتا ہے کہ کہیں درزی عین وقت پر کپڑے سینے سے انکار نہ کردے۔ درزیوں کے ذکر پر یاد آیا کہ، وہی درزی جو سال کے گیارہ مہینے تک کسی پالتو بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتے رہتے ہیں عید کے کچھ دن پہلے اس قدر طوطا چشم بن جاتے ہیں کہ جیسے کبھی پہچان نہیں تھی اور اِن کی اِس طوطا چشمی سے بچنے اور انھیں بدستور میاؤں میاؤں کے موڈ میں رکھنے کے لئے سمجھ دار لوگ عید سے مہینہ بھر پہلے ہی کپڑے اِن کے حوالے کر دیتے ہیں۔

جوتوں کی دکانوں میں اِس قدر رش ہوتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ ویسے گاہکوں کی سہولت کے لئے جوتوں کے ڈھیر لگا دیئے جاتے ہیں۔ نہ بھاؤ تاؤ نہ کوئی تکرار۔ فکسڈ ریٹ۔ بھیڑ بھاڑ میں پسند کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، بس جوتا پہن کر دیکھئے اور منہ مانگے دام دے کر جوتا لے کر چلتے بنئے البتہ ایسے موقعوں پر ذرا سی بھی غفلت عید کا سارا لطف پھیکا کر دیتی ہے نیا جوتا پہننے کے دوران آپ ذرا سا بھی چوکے تو سمجھئے آپ کا پرانا جوتا غائب۔۔۔

ایسا ہی ٹوپیوں کا معاملہ ہے۔ فٹ پاتھ پر ٹوپیاں بیچنے والے ٹوپی بیچنے سے زیادہ ٹوپی ڈالنے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسے موقعوں پر لازم ہے دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ گڑبڑ میں اِسکو دیکھئے تنہا نہ چھوڑیئے۔ لیکن کہاں تک حضور ایسے موقعوں پر تو بھول چوک ہو ہی جاتی ہے، بس اتنا خیال رہے کہ کوئی ایسی بھاری بھول نہ ہونے پائے جیسے کہ ایک منچلے سے ہوئی تھی۔ ایک برقعہ پوش حسینہ کے میک اپ زدہ چاند سے مکھڑے کی صرف ایک ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ کسی ہندوستانی فلمی ہیرو کی طرح

اِس قدر بے تاب ہوئے کہ دیوانہ وار اس کے پیچھے چل پڑے۔ اور ان کی سیکل جوفٹ پاتھ سے لگی کھڑی تھی ایک اور صاحب لے کر چلتے بنے۔ ویسے اِن منڑک چھاپ فرہادوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی غرض سے پولیس ہر موڑ پر جال بچھائے رہتی ہے اور یہ نئے مجنوں نئے فرہاد اس قدر آسانی سے اِس جال میں پھنس جاتے ہیں جس طرح ایک چوہا چوہے دان میں پھنس جاتا ہے اور پھر انہیں بڑی سسرال یعنی حوالات بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں ان کی کچھ ایسی خاطر کی جاتی ہے کہ پھر انہیں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور خطرے کی گھنٹی میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

کھوے سے کھوا چھلنا ایک محاورہ ہے لیکن اگر اسے حقیقت کے روپ میں دیکھنا ہو تو اس مخصوص رات لاڈ بازار کا رُخ کیجئے۔ چونکہ یہ بازار زنانہ آرائش و زیبائش کی اشیاء کے لیئے عالم گیر شہرت رکھتا ہے۔ اسلیئے یہاں کہ چپے چپے پر خواتین کا راج ہوتا ہے۔ (ویسے آجکل خواتین کا راج کہاں نہیں ہے) اور جگہ جگہ رنگ برنگے پیرہنوں کی لہراتی ہوئی قوس و قزح دیکھ کر مغلیہ دور کے مینا بازاروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ عید کے دن ہر سہاگن عورت کی کلائیوں میں چاہے وہ کتنی ہی بد زیب کیوں نہ ہوئی ڈزاین کی چوڑیوں کا ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ چوڑیاں ہی تو سہاگ کی نشانی کہلاتی ہیں۔ اور چونکہ سہاگ کا جوڑا یعنی شوہر آسانی سے اور گھڑی گھڑی بدلا نہیں جاسکتا لہذا چوڑیاں ہی بدل کر ایک عورت اپنی انا کو تسکین دے لیتی ہے۔

اِدھر صبح کا سپیدہ نمودار ہوا کہ دودھ کی فراہمی کا سلسلہ شروع۔ اس روز دودھ کی فراہمی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس روز بیشتر افراد اپنے آپ کو فرہاد کا جانشین سمجھنے میں حق بجانب ہوتے ہیں۔ انہیں جس کسی پر گوالے کا گمان

ہوتا ہے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ ایک صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ جب گوالے سے التجا ئیں کر کے تھک گئے تو بھینس کے آگے دو زانو ہو کر بین بجانے لگے۔ پتہ نہیں ان کی بین سُنکر بھینس نے اپنا سر جھکا دیا یا انہیں اپنے سینگوں پہ اٹھا لیا۔ اگر وہ ہم سے مشورہ لیتے جو کہ ہم ہمیشہ مفت دیتے ہیں تو انہیں ایسی ترکیب بتاتے کہ انہیں بھینس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ بھینس خود کچے دھاگے سے بندھی اِن کے ہاں چلی آتی۔ آپ بھی سُن لیجئے یہ ترکیب شاید مستقبل میں کام آئے۔ اگر پڑوس میں کسی کے ہاں بھینس ہو تو آتے جاتے الگ کی چوری سے اُسے پچکار دیئے۔ اسکی خیر خیریت دریافت کیجئے۔ کبھی کبھار گھاس وغیرہ سے اس کی ضیافت کیجئے۔ چند ہی دِنوں میں وہ آپ سے اس قدر مانوس ہو جائے گی کہ آپ جب، جس وقت اور جہاں کہیں چلی آئے گی۔ بہر حال دودھ کی فراہمی کے بعد دوسرا سب سے بڑا مسئلہ ہے نماز کے لئے کسی مسجد یا عید گاہ میں مناسب جگہ پانا۔ ہم نے ایک بار عید کی نماز کے بعد ایک بزرگ سے ان کے اگلی صف میں جگہ پانے کی ترکیب پوچھی۔ تو وہ بولے برخوردار میں جمعتہ الوداع پر جو مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو عید تک باہر نہیں نکلتا۔ عیدین کے موقعوں پر مسجد یا عیدگاہ کے احاطے میں جگہ پانا تو در کنار قرب و جوار کی گلیوں کوچوں میں تک جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ لوگ پرانے و نئے اخباروں سے جائے نمازوں کا کام لیتے ہیں۔ اخباروں کے ذکر پر یاد آیا ہمارے ایک پڑوسی ہیں۔ ردی کے بیوپاری، ہم نے عیدین کے موقعوں پر انہیں ہمیشہ ردی سے لدا پھندا گھر سے نکلتا دیکھا ہے۔ ایک بار ہم نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو وہ نہایت ہی رازدارانہ لہجے میں بولے۔ اب آپ سے کیا چھپانا آپ تو جانتے ہی ہیں میں بال بچے دار آدمی ہوں دھندے کو ہی عبادت سمجھتا ہوں ایسے موقعوں پر سب کو مناسب جگہ نہیں ملتی ہے، جس کو جہاں جگہ ملتی ہے کھڑا ہو جاتا ہے

لہٰذا لوگ ایسے موقعوں پر پرانے اخباروں سے جائے نمازوں کا کام لیتے ہیں۔ اور اپنا دھندہ چل جاتا ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر تو ردی اخبار بھی ردی کے بھاؤ نہیں بلکہ اصل سے دوگنی، تگنی قیمت پر بکتے ہیں مگر خیر آپ تو اپنے ہی ہیں آپ سے منافع کیا لینا آپ سے اخبار کی اصل قیمت ہی لوں گا۔ اور پھر وہ ہمیں ایک پرانا اخبار پکڑا کر نئے کی قیمت لے کر چلتے بنے۔

مسجدوں میں سے جوتوں، چپلوں کا غائب ہو جانا ایک عام بیماری ہے لیکن عیدین کے موقعوں پر تو سنا ہے کہ کئی رجسٹرڈ قسم کے گروہ جنکی کو اپریٹیو قسم کی فٹ پاتھی دوکانیں بھی ہیں۔ اس قدر منظم طریقے سے کام کرتے ہیں کہ ہزاروں جوتے مسجدوں میں سے غائب ہو کر ان کی دوکانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور جو جوتے چوری ہونے سے رہ جاتے ہیں وہ جان بوجھ کر بدل دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی پھرتیلے قسم کے سفید پوش چور شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے کسی کا نیا جوتا پہن کر اپنا پرانا جوتا بطور یادگار کے چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں ان دو دوستوں کی باتیں یاد آرہی ہیں جو ہم نے عید سے ایک دن پہلے سنی تھیں۔ جب ایک دوست دوسرے سے بولے۔۔ یار! تم نے اس بار شیروانی تو بہت شاندار بنوائی ہے، اب جوتا بھی اتنا ہی زوردار خریدو تو بات بنے گی۔۔۔ جواب میں وہ ہنس کر بولے میاں ہم نے جوتا نہ تو آج تک کبھی خریدا ہے اور نہ انشاءاللہ خریدیں گے۔ کل جب نماز کے لئے چلیں گے تو حسب معمول اپنی پسند کے مطابق جوتا بھی بدل لیں گے۔

بعض نوجوان عید کے دن پکچر دیکھنا سنت موکدہ سمجھتے ہیں اور ان کے اس شوق کو اور بھی ہوا دینے کی غرض سے اس خاص روز خاص طور سے نئی فلمیں نمائش کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ شائقین سینما عید گاہ سے سیدھے سینما گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں ہر کوئی کامیاب نہیں ہوتا۔ پھر بھی بعض شائقین

استعمال ہوتے ہیں کہ پہلے شو کا ٹکٹ نہ ملنے کی صورت میں دوسرے شو کیلئے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ بھی نہ ملنے کی صورت میں اگلے شو کے لئے بیٹھ جاتے ہیں، اور اگر بدقسمتی سے اس شو کا بھی ٹکٹ نہ ملے تو پھر آخری شو کے لئے بیٹھ جاتے ہیں مگر کیو سے باہر نہیں نکلتے اور اگر آخری شو میں بھی کامیاب نہیں ہو پاتے تو مجبوراً بے نیل و مرام گھر لوٹتے ضرور ہیں لیکن جب تک کہ وہ پکچر نہیں دیکھ لیتے کسی سے عید نہیں ملتے۔

عید کے دن ہر ایک کی اپنی مختلف مصروفیتیں ہوتی ہیں بعض اصحاب شیر خرمے کے سلسلے میں پچھلے تمام ریکارڈ توڑنے اور نئے ریکارڈ قائم کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو بعض اصحاب عطر کے پھاہے جمع کرنے میں مگن۔ ایک صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ عطر کی شیشیاں ہی لے کر مل دیتے ہیں با وثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اب ان کے پاس ہمہ اقسام کے اتنے عطریات اکٹھے ہو چکے ہیں کہ وہ چار رکمان کے پاس کسی خالی دوکان کی تلاش میں ہیں۔

عید کے روز مبارک بادیوں کے علاوہ اپنے سے چھوٹوں کو بطور عیدی کے کچھ نہ کچھ دینے کا دستور بھی ہے۔ اللہ نے اگر آپ کو نوازا ہے تو آپ بھی دوسروں کو نوازیئے، اور اگر پلے پھوٹی کوڑی نہ بھی ہو تو کم از کم بیوی کو تو بطور عیدی کے کچھ نہ کچھ دیا ہی جاسکتا ہے۔ یہ ہمارے ان پڑوسی کا قول ہے جو بطور عیدی کے ہر سال ایک جیتے جاگتے تحفے سے بیوی کی گود بھر دیتے ہیں۔ پچھلے چار برس سے یہ ریکارڈ قائم ہے۔ اور آثار بتلاتے ہیں کہ آئندہ چار برس تک بھی یوں ہی قائم و دائم رہے گا۔

عید کے دن بچوں کی چاندی ہوتی ہی ہے۔ ان کے علاوہ نئے دولھے بھی خوب مزے اڑاتے ہیں۔ پھولے پھولے پھرتے ہیں۔ دعوت اڑاتے ہیں۔ اور سلامی

کے روپ میں ایک اچھی خاصی رقم پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں اور یہی سوچتے ہیں کہ عید جو سال میں صرف ایک بار آتی ہے۔ کاش مہینہ میں ایک بار آتی بلکہ ہفتہ میں ایک بار۔ جب کہ بے چارے ساس و سسر کچھ یوں سوچتے ہیں کہ عید جو سال میں ایک بار آتی ہے کاش دس سال میں ایک بار آتی۔ لیکن عید نہ تو دس سال میں ایک بار آتی ہے اور نہ ہی ہفتہ میں ایک بار۔ بلکہ اپنے معینہ وقت پر ہنستے ہنگاموں، اور خوشیوں کے خزانے لٹاتی ہوئی چلی آتی ہے اور بخوشی یا مجبوراً یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ

عید مبارک !!!

●●

بیوی کے نام۔ دوستوں کی بیویوں سے معذرت کے ساتھ

بیوی اور فرمائش

"بیوی اور فرمائش" دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے ہی لازم و ملزوم ہیں جتنے کہ ایک جاندار کیلئے ہوا اور پانی۔ فرمائش دراصل اس ان دیکھے شکر میں لپٹے، زہریلے تیر کا نام ہے، جو ایک بیوی، چاہے ہوشیار ہو یا بدھو اداؤں کی کمان کو کس کس کر شوہر نامدار کی جیب کا نشانہ لے کر بلا نوٹس چھوڑتی ہے۔ اور جو شاذ و نادر ہی خطا کرتا ہے۔ اس تیر کی زد میں آنے کے بعد ایک شوہر کی تڑپ قابلِ دید ہوتی ہے۔ بلکہ اس بے چارے کے آباو اجداد کی روحیں بھی عالمِ برزخ میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں گی۔ خدا ہر شوہر کو اس جانکنی سے محفوظ رکھے۔

فرمائشوں کے اسٹائل ویسے فی زمانہ بدلتے رہے ہیں لیکن ان کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے وہ نہ تو آج تک بدلا ہے نہ بدلے گا۔ ایک زمانہ تھا جب بیویاں، شوہروں کو آزمانے کے لئے "شیر کا دودھ" "مچھر کی چربی" وغیرہ کی فرمائشیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن آج چونکہ ظاہری دکھاوے اور جھوٹی چمک دمک کا دور دورہ ہے اس لئے بیویوں کی فرمائشیں بھی اس جھوٹی چمک دمک کے دائرے تک ہی محدود ہو گئی ہیں۔ اور جھوٹی چمک دمک کا یہ دائرہ ایک مفلوک الحال شوہر کے حق میں چاند سے کم نہیں جیسے وہ دیکھ تو سکتا ہے لیکن روسی خلا بازوں کی طرح

وہاں پہنچ نہیں سکتا (شاعر حضرات اس سے متفق ہیں کہ یہ خود چاند میں پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ چاند کو اپنے آنگن میں اُتار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں بہتوں کی کھوپڑی چاند کی طرح چمکنے لگتی ہے)

فرمائش کا راکٹ داغنے کے بعد، ایک بیوی اس کے بخیر وخوبی واپس لینڈ کرنے تک گھر کی ہر شئے سے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ اور فرمائش کا یہ راکٹ شوہر نامدار کے گرد ایک مخصوص وقفہ تک چکر اتا رہتا ہے۔ اگر اس وقفہ کے دوران میں مطلوبہ فرمائش پوری کر دی گئی تو ٹھیک ورنہ راکٹ اور شوہر ناتوان دونوں کے پرخچے اُڑ جانے کا ڈر رہتا ہے۔ ویسے اس راکٹ کا کنٹرول سسٹم بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس طرح چاند زمین کے گرد گھومتا ہے اور زمین سورج کے اطراف اسی طرح فرمائشوں کے راکٹ شوہروں کے گرد اور بے چارے شوہر مخصوص سجی سجائی دکانوں کے چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ البتہ چاند، زمین اور سورج سال میں صرف ایک بار ایک مخصوص وقت "گہن" کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ شوہروں کی اکثریت بلا نوٹس اکثر گہن کی زد میں آجاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ماں کی گود بچے کی اولین درس گاہ ہوتی ہے۔ اور اس درسگاہ کی پرنسپل، لیکچرر، پروفیسر، چپراسی غرض سارا اسٹاف ماں کی ذات پر مشتمل ہوتا ہے مرد چونکہ فطرتاً کھلنڈرا اور آزاد ہوتا ہے۔ اور طالب علمی کے زمانے میں اس کا محبوب مشغلہ اسکول کو "بیٹ" مارنا ہوتا ہے، اس لئے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ اپنی اولین درس گاہ سے بھی اکثر غائب رہتا ہے۔ جب کہ ایک عورت جو کمزور اور قید و بند کی عادی ہوتی ہے اس اولین درس گاہ میں دن رات حاضر رہ کر ماں کی خوشنودی حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ سعادت اطوار بیٹی ماں کی تمام عادتیں اختیار کر لیتی ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ ایک عورت طرح طرح کی آرٹسٹک فرمائشیں کرنے کا درس اپنی

ماں سے یعنی ایک عورت ہی سے حاصل کرتی ہے۔
اپنی ڈکٹیٹر صفت ماں کو باپ پر حکومت کرتا دیکھ کر جہاں لڑکے کے دل میں شادی کے تعلق سے خوف گھر کرنے لگتا ہے وہیں لڑکی کے دل میں کسی مرد پر حکومت کرنے کی خواہش شدت کے ساتھ پنپنے لگتی ہے اپنی ماں کے عہدِ حکومت میں اسے جو بھی خامیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں اپنے عہدِ حکومت میں ان کی اصلاح کر لیتی ہے۔
خواتین کی اکثریت کا خیال ہے کہ صرف وہی عورت بیوی کہلانے کی مستحق ہے جو ہفتے میں کم از کم ایک بار کوئی "آرٹسٹک" قسم کی فرمائش ضرور کرتی ہو، بعض شادی شدہ دانشوروں کا کہنا ہے کہ ایک بیوی یہ احساس دلانے کے لئے ہی فرمائش کرتی ہے کہ وہ بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ عورت بھی ہے۔ سچ ہے ہر عورت بیوی نہیں ہوتی۔ لیکن ہر بیوی عورت ضرور ہو سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، جو عورت فرمائش نہیں کرتی وہ بیوی بننے کے لائق نہیں ہوتی۔ اور جو عورت فرمائش کرتی ہے وہ ضرور بیوی ہوتی ہے۔ اپنی نہ سہی کسی اور کی۔ اور دوسرے کی بیوی کی فرمائش پوری کرنے میں بعض مردوں کو وہی لطف آتا ہے جو محترمہ حوا کے چکر میں آ کر حضرت آدمؑ کو دانۂ گندم کا مزہ چکھنے میں آیا ہوگا۔ اس سلسلے میں بعض دل پھینک مرد نہ صرف اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں بلکہ دوسروں کے سروں اور دھڑوں کو بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اپنی بیوی کی فرمائش سن کر انہیں جیسے سانپ سونگھ جاتا ہے۔ بلکہ ڈس جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی بیوی کی فرمائش ہر شوہر کو زہر لگتی ہے (سوائے شادی کے ابتدائی ایام کے) ایسا زہر جو آدمی کو بتدریج زندگی سے دور اور موت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ اور ایک روز جب وہ پوری طرح مر جاتا ہے تو لوگ اس کی موت پر کم افسوس کرتے ہیں اور اس کی بیوہ سے ہمدردی زیادہ جتاتے ہیں۔ بلکہ بعض ہمدرد تو اسے نامعقول نااہل پتہ نہیں کیسے کیسے القابات سے نوازنا شروع کر دیتے ہیں

کہ کم بخت نے اپنی بیوی کے لئے کچھ نہیں سوچا۔ کچھ نہیں کیا' اور اچانک مرگیا لعنت ہے ایسی موت پر وغیرہ وغیرہ (ایسا عموماً کسی خوب صورت بیوی کے عین جوانی میں بیوہ ہونے پر ہوتا ہے) ہمارے ایک دوست ہیں جو دوسروں کی بیویوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہی ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی نے انہیں ذرا مسکرا کر دیکھ لیا تو وہ ہفتوں مسکراتے ہنستے بلکہ قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔ موصوف دوسروں کی بیویوں کی فرمائشوں کا خیال رکھنا اپنی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد سمجھتے ہیں۔ نتیجتہً اب تک ان کی اپنی دو بیویاں ان سے علاحدہ ہو چکی ہیں۔ موروثی جائداد نیلام ہو چکی ہے۔ اچھا خاصا کاروبار ٹھکانے لگ چکا ہے۔ مگر یار اپنے "مشن" سے باز نہیں آیا۔ اب تو اس مقصد میں اور شدت آگئی ہے، یعنی آجکل اس نے اپنے آپ کو کلیتہً دوسروں کی بیویوں کی چھوٹی بڑی فرمائشوں کی تکمیل کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

ہر عورت کو اول فول قسم کی فرمائشیں کرنے کا حق اسی وقت حاصل ہو جاتا ہے جب ایک نامعقول مرد ایک عدد وکیل اور دو عدد گواہوں کی موجودگی میں میں قبول کرتا ہوں کا اقرار کر کے عورت کو بیوی تسلیم کر لیتا ہے اور اس طرح بہ خوشی اپنی نکیل عورت کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے۔ اور پھر اپنی اس ایک بھول کی یاداش میں سب کچھ بھول جاتا ہے حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے ایک مرد کے روپ میں جنم لیا ہے۔ شادی سے پہلے جو ایک جیالا شیر تھا شادی کے بعد ایک ڈرپوک بکری بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک عورت جسے شادی سے ایک دن پہلے تک شدت سے اپنے صنف نازک ہونے کا احساس ہوتا ہے اور جو بکری کی طرح ممناتی رہتی ہے شادی کے بعد شیرنی کی طرح غرانے لگتی ہے۔ شیر اور بکری کے ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے والا محاورہ دراصل شیرنی صفت بیوی اور بکری صفت شوہر پر ہی صادق آتا ہے۔

آج بیویوں کی اکثریت کو "امپورٹیڈ" چیزوں کا مالیخولیا ہوگیا ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ اپنے یہاں وہی اشیاء امپورٹیڈ کہلاتی ہیں جو تیار تو اپنے ملک میں ہوتی ہیں لیکن ان پر مہر غیر ملکی لگی ہوتی ہے۔ خواتین کے "الٹرا ماڈرن طبقے" کا خیال ہے کہ "امپورٹیڈ" لبادے میں سجی سجائی عورت چاہے کالی پیلی ہو یا حسین و خوب صورت، مردوں کی محفل میں سر آنکھوں پر بٹھائی جاتی ہے۔ بلکہ بیشتر دل پھینک مرد ناک اور پیشانی پر بھی بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جو شوہر اپنی بیوی کے لیے، آرائش و زیبائش کی امپورٹیڈ اشیاء فراہم نہیں کرسکتا، بیویوں کی یونین اسے کسی اندھے جزیرے کی جانب تڑی پار کرنے کے قابل سمجھتی ہے۔ لیکن یہ چونکہ ناممکن ہے اس لئے ایسے غیر ذمہ دار شوہر کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے، یعنی اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے جاتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب مرد کو لبھانے اور رجھانے کے لیے ایک عورت کا "سولہ سنگھار" کرنا ہی کافی ہوتا تھا۔ لیکن آج اتنی مہنگائی کے باوجود بیچاری عورت "سولہ سو بناؤ سنگھار" کرنے پر مجبور ہے۔ خصوصاً بیوی کے لئے طرح طرح کے بناؤ سنگھار بے حد ضروری ہیں۔ کیونکہ اسے مرد کو نہ صرف لبھانا اور رجھانا ہے بلکہ اسے بس میں رکھنا ہوتا ہے (یہ اور بات ہے کہ شوہر بے چارہ وہ مرد نہیں ہوتا یا مرد ہی باقی نہیں رہتا۔)

جس طرح ایک مچھلی سارا پانی گندہ کر دیتی ہے اسی طرح کسی خاتون کو نئی امپورٹیڈ ساڑی میں بنی ٹھنی دیکھ کر دوسری تمام بیگمات کے سینوں پر سانپ، بلکہ اژدھے لوٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں اس وقت تک چین نہیں پڑتا جب تک شوہر نامدار ویسی ہی، یا اس سے بہتر ساڑی لاکر بیوی کے سینے پر لوٹتے ہوئے سانپوں اور اژدھوں کو اپنے سینے پر منتقل نہیں کرلیتا۔

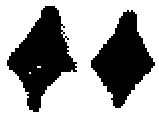
اس قسم کی خواتین پر گویا یہ محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ بلکہ اتنا زیادہ رنگ بدلتا ہے کہ خربوزے سے "بوزہ" نکل جاتا ہے۔

یوں تو ہر انسان میں نمود و نمائش کا جذبہ ہوتا ہے لیکن صنف نازک اس معاملے میں مردوں سے بہت آگے ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنی کسی فرمائش کی تکمیل پر جب تک مطلوبہ شئے کی نمائش کر کے اپنی تمام سہیلیوں اور ملنے جلنے والیوں پر اپنی شان و امارت کا رعب نہ جھاڑ لے اُسے چین نہیں پڑتا۔ اس جذبہ کی تکمیل کی خاطر ظاہر ہے وہ ان سب کی خوب خاطر کرتی ہے۔ (اور یہ خاطر بعد ازاں ان تمام ملنے جلنے والیوں کے شوہروں کے حق میں خطرہ ثابت ہوتی ہے۔) نتیجتاً خود اس کے شوہر نامراد کی جیب جو پہلے ہی ہلکی ہو چکی ہوتی ہے اس خواہ مخواہ کی تواضع میں بالکل خالی ہو جاتی ہے۔ اور وہ غریب چٹکی بھر زہر خریدنے کے موقف میں بھی نہیں رہتا۔

ہر بیوی نہ صرف فرمائش کرنا جانتی ہے بلکہ اس کی تکمیل کے حربوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوتی ہے۔ پہلے بگڑتی ہے پھر روٹھتی ہے، پھر آنسو بہاتی ہے سالن تیکھا کر دیتی ہے۔ روٹی جلا دیتی ہے۔ اور آخر میں سب سے کارگر حربے کا استعمال کرتی ہے۔ یعنی میکے چلے جانے کی دھمکی دیتی ہے۔ اور یہ دھمکی سنکر سورما شوہر بھی گھڑی بھر کے لئے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ بیوی کے میکے چلے جانے کے بعد ان کے کھانے پینے کے لالے پڑ جاتے ہیں بلکہ اس لئے کہ سسرالی رشتہ دار جو شادی کے دن سے ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں رہتے ہیں اپنے سیاسی داؤ پیچ کا مظاہرہ کر کے اس غریب کو اس کے اپنے متعلقین، کی نظروں میں نا اہل شوہر ثابت کر دیتے ہیں۔ اس لئے بیشتر داماد سسرال سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح ریاستی حکومتیں "مرکز" سے گھبراتی ہیں کہ جانے کب "صدر راج" نافذ ہو جائے۔

اور ابھی بھی "ریاستی کا بینہ" "نابینا" ہو کر دربدر کی ٹھوکروں کے حوالے ہو جائے
جیسے بھی بیوی کے نخرے اور سسرالی رشتہ داروں کے شتر نخرے، اچھے خاصے
مرد کو مرغ بلکہ "شتر مرغ" بنا دیتے ہیں۔

سُنا ہے بیوی کی فرمائش پوری نہ کرنے کی پاداش میں ایک نامعقول شوہر کو نہ صرف جیتے جی بلکہ مرنے کے بعد میدانِ حشر میں بھی طرح طرح کی دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ البتہ جیتے جی اس عذاب سے بچنے کا بس یہی صورت ہے کہ سرے سے شادی نہ کیجائے۔ اور اگر غلطی سے شادی ہو جائے تو بیوی کو خود پر حاوی نہ ہونے دیں۔ اور اگر بدقسمتی سے وہ حاوی ہو جائے تو اس کی فرمائش ایک کان سے سُنکر دوسرے کان سے اُڑا دینا چاہیئے۔ (اگر ایک ہی کان ہو تو مجبوری ہے) اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو بہانے بازی سے کام لینا چاہیئے۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو پھر نوے فی صد شوہروں کی طرح سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے۔ آگے جو مزاجِ یار میں آئے ۔۔۔ !!!



عمر بھر کا ساتھ

پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر گھستا چلا گیا۔ ابھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ ایک کھنکتی ہوئی نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی "آیئے تشریف لایئے" بالکل ایسے یوں لگا جیسے کہیں پاس ہی شیشے سے شیشہ ٹکرایا ہو۔ اور پھر پلک جھپکتے میں ایک چنچل سی نازنین کا سراپا نمودار ہوا اور اس رنگ و نور کے مجسمے کو دیکھتے ہی اس کا دل اچھل اٹھا۔

"شیشے پر کھنکے" بندی کو نازش کہتے ہیں۔ نام آپ کے لئے نیا نہیں ہے۔ اور چہرہ بھی دیکھا بھالا ہے۔ میری تصویر کو آپ نے خوب جی بھر کر دیکھا ہو گا۔ تین مہینے سے آپ کے پاس ہے۔ غالباً پسند آئی ہو گی۔ بے شک آئی ہو گی تب ہی تو بات بڑھ سکی ہے نا۔۔۔"

"سنیئے تو محترمہ۔۔۔"

"جی نہیں، آپ بس چپ چاپ یہاں تشریف رکھیئے۔ آج آپ کچھ سنانے نہیں بلکہ ہماری سننے کے لیے تشریف لائے ہیں۔"

"سننے کے لئے! مگر محترمہ سنیئے تو، میرا مطلب ہے دیکھئے تو۔۔۔"

"دیکھیئے شوق سے، دیکھیئے جی بھر کر دیکھیئے۔ لیکن سنیئے صرف ہماری آیا خیال شریف میں؟"

جی وہ خیالِ شریف تو آپ کی اس بیہودہ جھاڑ شرافت کو دیکھ کر ہی نو دو گیارہ ہو گیا۔"

یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس وقت امی اور ابو بھی نہیں ہیں۔ ہم ذرا کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میں نے ابھی سال ہی، اے کیا ہے سیکنڈ ڈویژن۔ یقیناً جانتے ہوں گے۔ کیوں کہ شادی کے سلسلے میں آپ کی پہلی شرط یہی ہے کہ لڑکی گریجویٹ ہو، سائنس کی ہو تو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر آرٹس کی ہو تو وہ بھی چلے گی۔ مگر تھرڈ ڈویژن نہیں۔ اور اس سلسلے میں بد قسمتی سے میں خوش قسمت ہوں۔ ہاں تو اس ایک شرط کے علاوہ آپکی چند اور بھی شرائط ہیں۔ مثلاً یہی کہ لڑکی خوب صورت ہو، کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، دراز گھنیری زلفیں، قد کم از کم پانچ فٹ پانچ انچ۔ صحت قابلِ رشک ہو۔ بے باک ہو۔ مگر نہ بہت زیادہ فیشن ایبل ہو اور نہ ہی ایک دم دقیانوسی ٹھیٹھ ٹائپ۔ انگریزی فر فر بولتی ہو۔

"جی ہاں فر فر بلکہ اگر اس فر فر میں "الف" اور "ر" کا اضافہ کیا جائے تو کیسی رہے گی؟

"الف" اور "ر"... اوہ سمجھی، آپ کا مطلب ہے فرار..."

"جی ہاں ــــ"

"بہت خوب۔ اشارہ سمجھ لیا ہے میں نے۔ ویسے فرار ممکن ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔ پہلے مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لینے دیجئے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ اپنی شریکِ حیات میں ان تمام چیزوں کو ایک جا دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ اسی لئے اپنی والدہ اور بہنوں کے دماغ میں ایک ایسی ہی لڑکی کا اسکیچ اُتار دیا۔ اور وہ بے چاریاں نکل کھڑی ہوئیں اُس کی تلاش میں اور پھر ایک دن اُن کی خوش قسمتی اور ہماری بد قسمتی کا میل ہوا۔ وہ ہمارے گھر آدھمکیں اور مجھے دیکھتے ہی اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے دماغ پر چھائی ہوئی وہ تصویر انسانی روپ میں ڈھل گئی اور بس۔"

جی نہیں، صرف بس نہیں بلکہ ڈبل بس۔"

"دیکھئے آپ یوں بار بار مداخلت نہ کیجئے۔"

"غلطی ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میں یہ بھول گیا تھا کہ آپکے دولت کدے میں داخل ہوتے ہی میں ہر قسم کی جائز مداخلت کے حق سے بھی محروم ہو چکا ہوں خیر آپ سنائیے اپنی داستان"۔

"اب داستان رہ ہی کیا گئی ہے، آپکی والدہ اور بہنوں نے مجھے دیکھتے ہی پسند کر لیا اور دوسرے ہی دن لین دین اور جوڑے وغیرہ کی رقم کے سلسلے میں بات چیت شروع ہو گئی جو میری نظر میں اصل فتور کی جڑ ہے ......"

"اور آپ کی یہ بڑ اسی فتور کی جڑ کے متعلق ہے ...."

"جی ہاں، میں اس جوڑے گھوڑے کے سخت خلاف ہوں۔ کبھی آپ نے کسی باپ کو اپنی بیٹی کو یوں ہی کسی کے گلے باندھتے ہوئے دیکھا ہے، ایک باپ اپنی حیثیت کے مطابق بلکہ اکثر اپنی حیثیت سے بڑھ کر ہی اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود ان لڑکے والوں کی یہ طرح طرح کی مانگیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہونے والے داماد صاحب کی پانچ ہزار، دس ہزار کی اس مانگ کو میں قطعی ناجائز سمجھتی ہوں۔ اور پھر بات اس جوڑے گھوڑے تک ہی ہوتی تو غنیمت تھا۔ اصل رونا تو یہ ہے کہ ایک کثیر رقم کی مانگ کے علاوہ اور بھی کئی چیزوں کی بطورِ خاص فرمائش کی جاتی ہے۔ آپ سن رہے ہیں نا جناب؟"

"جی ہاں بالکل۔ مجھے تو اب دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ آپ نہایت خوبصورتی سے حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھا رہی ہیں، میں اس قسم کی نقاب کشائی کا مدتوں سے منتظر تھا۔ ہاں آپ آگے کہیئے، میں نہ صرف سن رہا ہوں بلکہ سمجھ بھی رہا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہاں تو فرمائشوں کی یہ فہرست ویسے تو ہمہ اقسام کی الم غلم چیزوں سے بھری ہوتی ہے مگر میں یہاں صرف چند خاص چیزوں پر ہی روشنی ڈالوں گی۔ ایک عدد سکوٹر یا سائیکل کی فرمائش اس فہرست کا اہم جز ہوتی ہے۔ پھر ایک عدد ریڈیوگرام یا ریڈیو کا نمبر آتا ہے۔ پھر ایک عدد گھڑی وہ بھی درآمد شدہ اور اس کے علاوہ ....."

"فریج، ٹائپ رائٹر، بجلی کا پنکھا، سنگھار میز، اسٹیل کی الماریاں، فوم ربڑ کے بستر سے لیس پلنگ، صوفہ سیٹ، ڈنر سیٹ، فروٹ سیٹ، ٹی سیٹ......

"جناب آپ نے میری بات کیوں اُچک لی؟"

"معافی چاہتا ہوں۔ دراصل آپ کے اس جذباتی اندازِ بیان نے ذرا مجھے بھی جذباتی بنا دیا تھا۔ اسلئے میں بہک گیا۔ لیجئے اب میں چپ ہوں۔ آپ آگے کہئے..."

"آگے کہنے سے پہلے یہ بات واضح کردوں کہ میری اس گفتگو سے آپ کہیں یہ اندازہ نہ لگا لیجئے کہ میں کسی مفلس و قلاش باپ کی بیٹی ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے میرے ابو کی مالی حالت اس قابل ہے کہ میری شادی پر پندرہ بیس ہزار تک خرچ کرسکتے ہیں۔ باجی کی شادی پر تو انہوں نے چالیس ہزار کے لگ بھگ خرچ کئے تھے"

"کئے ہونگے صاحب، ضرور کئے ہوں گے۔ اللہ دولت دے تو خرچ کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کی باجی کی شادی پر تو چالیس ہزار کے لگ بھگ خرچ کر دیئے لیکن آپ کے سلسلے میں پچاس فیصدی بجٹ کیوں گھٹا دیا؟"

"صاف ظاہر ہے، باجی کی شادی کے وقت وہ برسرِکار تھے اور اب وظیفہ یاب ہیں بہرحال پندرہ بیس ہزار تک خرچ کر دینا اب بھی اُنکے لئے مشکل نہیں مگر آپ نے جو اپنی فرمائشوں کی فہرست بطورِ خاص بھیجی ہے....."

"فرمائشوں کی فہرست نہیں، بلکہ الکٹرک بل ہوگا"

"چلئے بل ہی سہی۔ بہرحال آپکے اس بل کو دیکھ کر دل تھام لینا پڑا، کیونکہ آپ کی فرمائشوں کی فہرست دیکھ کر پتہ چلا کہ پندرہ بیس ہزار سے تو آپکا پیٹ بھی نہیں بھرنے گا آپکی اس فہرست نے میرے اس تصور کو بُری طرح مجروح کر دیا جو میں نے اپنے شریک زندگی کے متعلق باندھ رکھا تھا۔ فرض کیجئے میں ایک مفلس باپ کی بیٹی ہوں تو کیا میرا بھی وہی حشر نہ ہوتا جو ہزاروں لاکھوں غریب لڑکیوں کا ہوتا ہے... آخر آپ لوگ کیسا

سمجھتے ہیں؟ کیا ان غریب لڑکیوں کے سینوں میں ارمان نہیں ہوتے، جذبات نہیں ہوتے احساسات نہیں ہوتے؟ کیا ان کے دل میں اپنے گھر کی، شوہر کی، بچوں کی آرزو نہیں ہوتی؟ آرزو جس کی تکمیل کی خاطر انہیں اپنی عزت و آبرو سے خود کھیلنا پڑتا ہے، اور پھر انجام کار رسوائیوں کے گہرے غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مدفون ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار ہے ہمارا یہ کھوکھلا سماج اور یہ بزدل نوجوان، جو لڑکی سے زیادہ اُس کی دولت کے بھوکے ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں بالکل بے شک بھوکے ہوتے ہیں۔ خدا اُن کی اس بھوک کا خاتمہ بالخیر کرے ورنہ ایک دن وہ آئے گا جب ان معصوم لڑکیوں کی آہوں کا ایک ریلا اٹھے گا اور اُن سب کو فنا کر دے گا۔ اور آنے والی نسلیں اُن بزدل نوجوانوں کے بارے میں کہیں گی کہ خس کم جہاں پاک....."

"جناب آپ میری ہاں میں ہاں کیوں ملا رہے ہیں۔"

"جی نہیں میں تو آپ کی ناں میں ہاں ملا رہا ہوں۔ خیر آپ آگے کہئے میں مثلِ خرگوش ہمہ تن گوش ہوں۔"

"آپکی اس زندہ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنا یہ ہے کہ میں اپنی سہیلیوں کے سامنے عہد کر چکی ہوں کہ میں صرف اُسی شخص کو اپنا شریک زندگی بناؤں گی جو صرف میری چاہ کرے میرے روپے پیسے کی نہیں۔ اور اسی لئے آج آپ کو یہاں بلایا ہے، تاکہ میرے خیالات جاننے کے بعد شائد آپ اپنی فرمائشوں کی فہرست پر نظرِ ثانی کریں۔ ویسے آپ کی فرمائشوں کی فہرست دیکھنے کے بعد ہی ارادہ تھا کہ فوراً انکار کر دوں لیکن پھر سوچا کہ کیوں نہ آپکو ایک موقع دیا جائے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مانا کہ آپ خاندانی ہیں۔ صورت شکل بھی بری نہیں۔ اور پھر پڑھے لکھے بھی ہیں، انجینئرنگ کی ڈگری رکھتے ہیں۔ پانچ سو روپے تنخواہ پاتے ہیں۔"

"آپ...... یہ..... پانچ سو روپے....."

"جی ہاں۔ اور اِس دور میں لڑکیوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بلکہ اُلٹی بڑی ہیں کوئی بھی بلیب بخوشی یا مجبوراً آپ کی ساری بجا وبے جا فرمائشیں اور مانگیں پوری کر ہی دیگا۔ اب بتایئے آپ کا کیا فیصلہ ہے، اپنی فرمائشوں کا بٹ واپس لے کر مجھے اپنا بنانے کا، یا پھر اپنی فرمائشوں کا پٹارہ لے کر کوئی اور در کھٹکھٹانے کا۔ ایسی صورت میں مجھے انکار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ابو نے مجھے پوری آزادی دے رکھی ہے۔۔۔۔۔"

"اُسی پل ایک ملازمہ ہانپتی کانپتی داخل ہوئی اور آتے ہی کہنے لگی۔ "بی بی جی، بی بی جی! غضب ہوگیا! وہ جو چھٹی آپ نے امجد میاں کے نام لکھی تھی نا! اُسے پڑھنے کے بعد اُن کے سارے گھر میں وہ ہائے ہے کہ اللہ کی پناہ! کوئی آپکے آزاد، ادباتی کہہ رہا ہے تو کوئی آپ کے یوں امجد میاں کے نام یہ چھٹی لکھنے اور انہیں اکیلے بلانے پر طرح طرح کے نام دھر رہا ہے۔ اور امجد میاں کی اماں تو کہہ رہی تھیں کہ اچھا ہوا شادی سے پہلے ہی اُس بے چھوکری کی قلعی کھل گئی۔ اتنی دیدہ دلیری توبہ توبہ!"

"اری کم بخت یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟" نازش نے گڑبڑا کر کہا، اور پھر اُس اجنبی نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: "ذرا انہیں غور سے دیکھ! کیا یہ امجد نہیں ہے؟"

"نہیں، بی بی جی، یہ امجد میاں نہیں۔"

"کیا کہا یہ امجد نہیں؟" اسکی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ اور پھر وہ اُس اجنبی پر برس پڑی۔ "جناب آخر آپ ہیں کون جو اتنی بے تکلفی سے یہاں اتنی دیر سے براجمان ہیں۔"

"دیکھیے محترمہ، آپ یوں آنکھیں لال پیلی نہ کیجیے۔ میں یہاں اپنی مرضی سے بیٹھا نہیں بلکہ بیٹھایا گیا ہوں۔" نوجوان نے نہایت ادب سے کہا، اور نازش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ ذرا نرم لہجے میں بولی "معاف کیجیے مجھ سے غلطی ہوگئی۔ دراصل میں نے آپ کو وہ سمجھ لیا تھا جو کہ آپ نہیں ہیں۔"

"اب جب کہ آپ نے مجھے وہ سمجھ ہی لیا ہے جو میں نہیں ہوں، حالانکہ میں وہی ہونا

جو میں ہوں، تو کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔" نوجوان نے جواب طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کے ہلکے سے اشارے پر نہایت ہی سلجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا: "مجھے امتیاز کہتے ہیں۔ میں اسٹیٹ الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ میں انسپکٹر ہوں۔ آپ کے الیکٹرک میٹر کے بارے میں آپ کے ہاں سے متعدد شکایتیں آئی تھیں، اسی لئے میں میٹر بدلنے آیا تھا۔ لیکن آپ نے مجھے کچھ اور سمجھ لیا۔ میں نے اس درمیان کئی بار اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی، مگر آپ نے ہر بار چپ کرا دیا اور میں بھی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بس آپ ہی کی سنتا رہا۔ اور شروع شروع میں سر دھنتا رہا۔ مگر جوں جوں آپ کی گفتگو بڑھتی گئی۔ میری دل چسپی بھی بڑھتی گئی۔ اور میں متاثر ہوتا گیا۔ دراصل اس لین دین اور جوڑے وغیرہ کے سلسلے میں میرے بھی بالکل آپ کے سے خیالات ہیں، یعنی اس سلسلے میں ہم دونوں ہم خیال ہیں۔ میں بھی ان باتوں کو ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ دراصل خود لڑکی کے والدین نے ان غیر ضروری چیزوں کو اپنے اوپر فرض تصور کر لیا ہے۔ بہر حال آپ کی بے باکی اور صاف گوئی نے مجھے کچھ زیادہ متاثر کیا ہے کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کہیں اسے گستاخی نہ سمجھ لیں، اسی لئے کہنے سے جھجک رہا ہوں ...."

"جھجکنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ بے خوف ہو کر کہیئے ..."

"دیکھئے میرے پاس انجینئرنگ کی ڈگری تو نہیں ہے، ہاں الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا ہے، اور آجکل ڈگری کی تیاری کر رہا ہوں، میری تنخواہ بھی فی الوقت پانچ سو نہیں بلکہ سوا تین سو ہے، البتہ خاندانی ضرور ہوں۔ آپ کے چچا زاد بھائی اشفاق میرے خاندان سے اچھی طرح واقف ہیں، ایک آبائی مکان ہے جس میں ہم سب رہتے ہیں، بڑے بھائی، بھابی صاحبہ اُن کے چار بچے اور ایک چھوٹا بھائی۔ والد صاحب کی فی الوقت پانچ چھ سو روپے ماہوار آمدنی ہے۔ بھائی صاحب کے سوا دو سو کے لگ بھگ آتے ہیں اور میرے سوا تین سو روپے ہیں۔ مگر سب خوش ہیں۔ معیارِ زندگی متوسط ہے۔ اب رہا صورت شکل

کا سوال، تو جو بھی کچھ ہوں جیسا بھی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔ بہرحال میرے بارے میں اتنا سب جاننے کے بعد اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اپنی والدہ اور بھابی کو بھیجوں آپکے والدین کے پاس ...؛ امتیاز کے ایک ایک لفظ سے سچائی اور خلوص ٹپک رہا تھا۔"

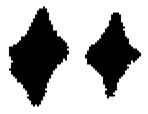
"نازش کی نظریں شرم سے خود بہ خود جھک گئیں، اس نے زبان ہلانی چاہی مگر لفظ پھڑپھڑا کر رہ گئے، اسکی بے باکی جانے کہاں رفوچکر ہو گئی تھی، امتیاز اُس کے اس انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا، "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کیا میں اپنی بھابی اور والدہ کو بھیجوں آپ کے ہاں ..."

"آپ کی مرضی ..." پل بھر کو نظر اٹھی، لب ہلے اور وہ شرما کر اندر بھاگ گئی، اور امتیاز گنگناتا ہوا خوش خوش برآمدے سے باہر نکلا ہی تھا کہ شیشے پھر کھنکے" میڈ تو بدلتے جایئے ......"

"وہ تو بدلا جا چکا ....."

"کب؟ کون سا؟"

"ابھی ابھی، وہی جو سینے میں دھڑکتا ہے ..." وہ بڑی بےجستگی سے بولا اور اُدھر ایک نازک سا ہاتھ کھڑکی کی اوٹ سے لہرایا "خدا حافظ" اور امتیاز مسکراتا ہوا باہر نکل گیا ....."



سسرال جی کا جنجال

سسرالی رشتہ داروں سے معذرت کے ساتھ

سُنا ہے جنت اور دوزخ صرف عالمِ بالا میں نہیں بلکہ اس عالمِ گڑبڑ گھٹالا میں بھی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ عوام النّاس کا وہ طبقہ جو ناس نہیں لیتا اس کا کہنا ہے کہ یہ کسی کی اڑائی ہوئی افواہ ہے جبکہ وہ طبقہ جو ناس لیتا ہے اس کا خیال ہے کہ یہ بات کہتے وقت بزرگوں نے چٹکی بھر ناس ضرور لی ہوگی۔ اس لئے یہ بات درست ہے۔ ہمیں بھی اس طبقہ کی بات کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ ویسے ہم نے آج تک کبھی ناس نہیں لی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ جہانِ خانہ خراب مختلف چھوٹے بڑے خانوں یعنی ملکوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور ہر خانہ بے شمار مختلف سائز اور رنگ کے خانوں میں جو عرفِ عام میں غریب خانے، دولت خانے، مُیتّ خانے، زچگی خانے وغیرہ کہلاتے ہیں۔

ایک خانہ چاہے ہندوستانی غریب خانہ ہو یا امریکی دولت خانہ ایک نہ ایک دن کسی کا سسرال ضرور بنتا ہے اور سسرال ہی وہ ٹھکانہ ہے جہاں زمین پر رہ کر آسمانوں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ یعنی جنت و دوزخ کا ٹیلی کمر ٹیلر دیکھا جا سکتا ہے ایک خوش نصیب داماد کے حق میں سسرال جہاں جنت کی "ٹرو کاپی" ہوتا ہے وہیں ایک بدنصیب

داماد کے حق میں دوزخ کی "کاربن کاپی" ہوتا ہے۔

غالباً سسرال ہی وہ واحد لفظ ہے جس سے ہر مہذب جاہل، ہر کس و ناکس کے کان آشنا ہوتے ہیں۔ سسرال کا نام سن کر بیشتر کنوارے نوجوانوں بلکہ بوڑھوں کے بھی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ ویسے بھی لفظ سسرال میں سے "سس" نکال دیا جائے تو صرف "رال" ہی رہ جاتی ہے۔ جس طرح ایک بچہ چڑیا گھر کا نام سنکر خوش ہوتا ہے اسی طرح جوانی میں سسرال کا نام سنکر ہر کنوارے شخص کے من میں لڈو بلکہ گلاب جامن، رس گلے وغیرہ پھوٹنے لگتے ہیں اور جب یہ لڈو وغیرہ پوری طرح پھوٹ چکے ہوتے ہیں تب ہر شخص یہ سوچ کر پچھتاتا ہے کہ کاش یہ لڈو وغیرہ اسی طرح صحیح سلامت رہتے، بدلے میں بھلے ہی اسکا یا اس کے رشتہ داروں کا سر پھوٹ جاتا۔ مگر سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے سمجھدار لوگ ایسے موقعوں پر لکیر پیٹنے کے بجائے ایک دوسرے کو پیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ سسرال دراصل اس گھر کو کہتے ہیں جہاں ہر مرد کو ایک نہ ایک دن ضرور جانا ہے، کوئی ہنسی خوشی سہرے گہنے سے لد پھند کر باجے گاجوں کی دھوم کے ساتھ دولہا بن کر جاتا ہے تو کوئی زبردستی پہنچا دیا جاتا ہے۔ بس ایک بار قدم رنجہ فرمانا شرط ہے پھر قدم رنجہ فرمانے والا خود بخود گنجا ہو جاتا ہے۔ سسرال کے دلدل میں اس کے قدم کچھ اس طرح دھنس جاتے ہیں کہ پھر اس کے بلکہ اس کے متعلقین کے لاکھ زور لگانے پر بھی نہیں نکل پاتے بلکہ اور بھی دھنستے چلے جاتے ہیں۔ (ایسے بدنصیب داماد کی پہچان بہت آسان ہوتی ہے۔ اس کے گال اندر کو دھنسے ہوتے ہیں، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوتی ہیں۔ پیٹ اندر کو دھنسا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ زندگی میں ہی قبر میں دھنسا ہوا نظر آتا ہے۔)

جہاں تک سسرال کے جدود اربعہ کا تعلق ہے۔ سنا ہے جتنے بھی جواں مرد اس ناقابل تسخیر مہم کو سر کرنے کے لئے سر سے کفن باندھ کر جان ہتھیلی پر لیے ہوئے نکلے

تھے آج تک لوٹ کر نہیں آئے غالباً ان بدنصیبوں کو سرتاپا کفن میں لپیٹ کر، ہتھیلی پر جنت کا ٹریلر دکھا کر، سسرال کی بھول بھلیوں میں ایسا الجھایا گیا کہ وہ اپنا بلکہ اپنے آباؤ اجداد کا اگلا پچھلا سارا جغرافیہ بھول گئے۔ آج تک کوئی مائی کا لال، سسرال کا صحیح جغرافیہ نہیں معلوم کر سکا۔ مستقبل میں جو بھی جوانمرد اس میں کامیاب ہوگا وہ یقیناً دنیا کی ہر تاریخ بلکہ جغرافیہ میں وہی مقام پائے گا جو امریکہ کی دریافت پر کولمبس کو ملا ہے۔ انجام بہرحال اس کا بھی کولمبس جیسا ہی ہوگا۔ (واضح ہو کہ کولمبس نے اپنی زندگی کے آخری ایام، جیل کی کال کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کاٹے تھے)

شادی کے ابتدائی ایام میں لڑکے، کے رشتہ داروں کو عموماً یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے ہونہار، فرمانبردار، برخوردار سسرال کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب آپ ہی کہیے، کیا ان کی یہ شکایت بجا ہے۔ ؟ اس میں بھلا برخوردار کا کیا قصور، یہ تو قدرتی بات ہے، جس طرح زمین سے ایک مخصوص بلندی پر پہنچ جانے کے بعد ہر چیز زمین کی "کشش ثقل" سے آزاد ہو جاتی ہے، اسی طرح سسرال کی باؤنڈری میں پہنچ کر ایک داماد کچھ عرصہ کیلئے ہر باہری کشش سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ مدت قلیل بھی ہو سکتی ہے، طویل بھی۔ اس کا تمامتر دارومدار سسرالی کشش پر ہوتا ہے۔

لفظ 'سسرال' کو اگر اس طرح الگ الگ پڑھا جائے۔ سسر۔۔۔آل۔۔۔ تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سسرال یعنی سسر کی آل، یعنی وہ گھر جو سسر صاحب کی آل و اولاد سے بھرا پڑا ہے۔ سسرال کی بیل باڑی، حالانکہ سسر صاحب کے دم کی برکت بلکہ حرکت سے وجود میں آتی ہے، پھولتی پھلتی ہے، پروان چڑھتی ہے، لیکن اسکے باوجود بے چارے سسر کو وہ مقام نہیں ملتا جس مقام کی، ان کی شخصیت متقاضی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ہر بڑی شخصیت کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن بے چارے سسر چونکہ صرف نام کے بڑے ہوتے ہیں اس لئے جس عورت کا وجود دراصل ان کے پیچھے ہونا چاہیے

وہ ہمیشہ خم ٹھونکے ان کے آگے نظر آتی ہے۔ اور بے چارے سسر مصلحتاً یا مجبوراً اس عورت کو سب کچھ مان کر اس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھر کے چپے چپے پر اس عورت کا راج ہوتا ہے جسے دامادوں کی اصطلاح میں "ساس" یعنی مدر۔ ان۔ لا کہتے ہیں۔ یہ سسرال کے تمام سیاہ و سفید بلکہ ہر رنگ کی مالک ہوتی ہے۔ اس کے اشارے پر سسرال کے آنگن میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ چاند نکلتا ہے، ستارے گردش کرتے ہیں اور جو اس کے اشارے پر سر تسلیم خم نہیں کرتا اس کے ستارے خود بخود گردش میں آجاتے ہیں۔ ساس صاحبہ کی اس مسلمہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے سسرال کو اگر ساس کی جوپال کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ کسی دوراندیش داماد کا مقولہ ہے کہ "جب تک ساس تب تک آس" جو داماد اس مقولے پر آنکھ موند کر ایمان لے آتے ہیں ان کے حق میں وہی سسرال جو بے چارے سسر کے حق میں جہنم سے کم نہیں ہوتا، جنت کا نمونہ بن جاتا ہے اور جو کم عقل داماد ساس کی اس مسلمہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے وہ ساس کی اس خود ساختہ جنت میں خود نمونہ بن جاتے ہیں۔ ساس کو "خوشدامن" بھی کہتے ہیں یہ نام غالباً کسی ایسے داماد کا دیا ہوا ہے جس کے خالی دامن کو کسی فراخ دل ساس نے خوشیوں سے بھر دیا ہو۔ فارسی میں ساس کے معنی کھٹمل کے ہیں۔ کاش اردو میں بھی یہی معنی ہوتے ویسے بلا تخصیص زبان بیشتر ساسیں فارسی کی ساس ثابت ہوتی ہیں۔

سسرالی رشتہ داروں کو انگریزی میں "in - Laws" کہتے ہیں، یعنی قانونی حدود میں رہنے والے لیکن اکثر اوقات یہ in. Laws انگریزی کے "out Laws" یعنی قانون شکن ثابت ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں شادی صرف بیوی سے نہیں بلکہ پورے سسرال سے ہوتی ہے اس لئے خانہ آبادی کہلاتی ہے۔ البتہ خانہ آباد ہونے کے بعد بے چارے داماد کا خانہ کس طرح خراب ہوتا ہے اس طرف بہت کم لوگوں کا دھیان جاتا ہے۔ بیشتر اصحاب تو اس

مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ آم کھانے سے مطلب رکھو پیڑ گننے سے کیا حاصل ۔ ؟ لیکن ایسے داماد کو جو سسرال میں نیا رنگروٹ ہو، آم کھانے سے پہلے سارے پیڑ بلکہ پتے بھی گننے پڑتے ہیں ۔ اور بسا اوقات پیڑوں کی اس "مردم شماری" میں ہی عمر تمام ہو جاتی ہے ۔

ایک نیا داماد، چونکہ سسرالی پینتروں اور ہتھکنڈوں سے ناواقف ہوتا ہے ۔ اس لئے ابتدائی ایام میں ساس کو عالم آرا کی بیٹی اور سسر کو حاتم طائی کا حقیقی جانشین سمجھتا ہے ۔ اور ان کے اس احسان کا اُسے کچھ زیادہ ہی پاس ہوتا ہے ۔ کہ انہوں نے ہی تو اپنا "جگر گوشہ" اس کے حوالے کر کے اُس کے سُونے سونے ویران گھر کو آباد کیا ہے ، لیکن جب سسرالی رشتہ داروں کا اصلی رُوپ اس کے سامنے آتا ہے تب تک ایک تو آٹے دال کا چکر اس کے سارے جوش اور ولولوں پر پانی پھیر چکا ہوتا ہے دوسرے ساس و سسر کا جگر گوشہ ، بیوی کے رُوپ میں اُس کے پہلو میں پہنچ کر، اُس کے واحد جگر کا صفایا کر چکا ہوتا ہے ۔ اور وہ غریب اس موقف میں بھی نہیں رہتا کہ چچا غالب کی زبان میں کم از کم اتنا ہی کہہ سکے ؂

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

یہی وجہ ہے کہ نوّے فی صد داماد لاکھ چاہنے پر بھی ، سرِ عام ، سسرالی رشتہ داروں کی بُرائی نہیں کر پاتے ، بس دل ہی دل میں کڑھتے رہتے ہیں ۔ اور اسی طرح کڑھتے کڑھتے ایک دن خود بھی سسر بن جاتے ہیں ۔

ساس کے بعد سسرال کے نقار خانے میں اگر کسی اور طوطی کی آواز گونجتی ہے تو وہ ہے سالی ۔ اور سالیوں کے نرغے میں پہنچ کر ایک بھولا بھالا آدمی اپنے آپ کو راجہ اندر کا جائز جانشین سمجھتا ہے ، لیکن یہ خواب اُس وقت چکنا چُور ہو جاتا ہے جب سالیاں اُسے کاٹھ کا اُلّو ثابت کر دیتی ہیں ۔ یوں تو بیوی کی چھوٹی بڑی رشتہ ناطے کی ہر بہن سالی

کہلاتی ہے، لیکن جہاں تک سالیوں کے جائز و ناجائز حقوق کا تعلق ہے یہ تمام حقوق چھوٹی سالی اپنے نام کروالیتی ہے، یہ چاہے سفید سر والی ہو، دودھ پیتی ہو، انگوٹھا چوستی ہو، بالغ جاتی ہو یا بہنوئی کے قدم رنجہ فرمانے کے بعد عالم وجود میں آئی ہو چھوٹی ہی کہلاتی ہے۔ اور اپنے چھوٹے ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے، بہنوئی کو تو بہن کی "ملکیت" سمجھتی ہے۔ لیکن اس کی جیب پر اپنا حق جتاتی ہے، ہلدی مہندی یعنی ساچق کے دن ہی سے بہنوئی کے پیچھے پڑ جاتی ہے بلکہ کسی "پیر تسمہ پا" کی طرح چمٹ جاتی ہے۔ البتہ بڑی سالی کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے ایک تو وہ پہلے ہی اپنے گھر کی ہو چکی ہوتی ہے دوسرے وہ سالی کم اور ساس زیادہ بننے کی کوشش کرتی ہے۔ بہرحال سالیوں کے ان ناز و نخروں کے باوجود ہر بہنوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی کچھ سالیاں ضرور ہوں، کم از کم آدھا درجن تاکہ زندگی کے بحر الکاہل میں کچھ تو تلاطم پیدا ہو۔

جسطرح گھر کے اندر ساس کے بعد سالیوں کے نام کے سکے چلتے ہیں، اسی طرح گھر سے باہر سالوں کے نام کے سکے چلتے ہیں۔ جو دراصل "دھن لگانے" کے وقت بہنوئی ہی سے ہتیائے ہوئے ہوتے ہیں۔ سچ ہے ایک شخص چاہے کھوٹا سکہ ہی کیوں نہ ہو سالا بننے کے بعد خوب چلنے یعنی چھکنے لگتا ہے سالوں کو سالار جنگ بھی کہتے ہیں۔ بعض سالے ایسی ایسی نادر الوجود حرکتیں کرتے ہیں کہ چلتا پھرتا سالار جنگ میوزیم معلوم ہوتے ہیں۔ سالا کتنا ہی بد اخلاق کیوں نہ ہو، چونکہ نصف بہتر کا بھائی ہوتا ہے اس لئے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لوگ غالباً اپنے سالوں کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ انہیں بھی کوئی برداشت کرتا ہے۔

سالے کے بعد سسرال کی چار دیواری بلکہ بارہ دری میں اگر کوئی اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے تو وہ ہے "ہم زلف" ایک ہی گھرانے کے داماد آپس میں

ہم زلف کہلاتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ہی گھر میں پروان چڑھنے والی الگ الگ زلفوں کی زنجیر سے بندھے ہوتے ہیں۔ ویسے ہم زلف کو عرف عام میں 'ساڑو' بھی کہتے ہیں لیکن ساڑھو چونکہ 'بھاڑو' کا ہم قافیہ لفظ ہے اس لئے مہذب گھرانوں کے داماد اس لفظ سے چڑتے ہیں۔ اکثر گھرانوں کے داماد "زلفوں" سے محروم ہونے، یعنی گنجے ہونے کے باوجود "ہم زلف" کہلاتے ہیں۔

سسرال کی فضا کو خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے "ہم زلفوں" کا ہم خیال ہونا ضروری ہے اور اس سے زیادہ ان کا ہم پلہ ہونا۔ اگر کسی ہم زلف کا پلہ ہلکا پڑ جائے تو پھر توازن بگڑ جاتا ہے، لیکن ساس اگر مدبر سیاست داں قسم کی ہو تو اس بگڑے ہوئے توازن کو سنبھال لیتی ہے، ورنہ گھر کا میدان، جنگ کے میدان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

سُنا ہے پہلے زمانے میں جب تک گھر کی جوان بیٹیاں ٹھکانے نہیں لگ جاتی تھیں بہو نہیں لائی جاتی تھی۔ لیکن اب چونکہ زمانہ بدل چکا ہے اس لئے بیشتر والدین بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے سے پہلے، بہوئے آتے ہیں۔ تاکہ گھر کی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہونے سے پہلے کام کر کر کے پیلے پڑ جائیں۔ ایسے گھرانوں میں جو داماد قدم رکھتا ہے اُسے ایک ساتھ دو مورچوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو ایک دوسرے کے مقابل ڈٹے ہوتے ہیں ایک تو ساس، دوسرے سالے کی بیوی۔ یعنی گھر کی بہو، جو بلا شرکتِ غیرے (حتیٰ کہ شوہر تک کو شمار نہیں کرتی) خود کو گھر کی ہر چیز کی مالک سمجھتی ہے۔ ایسی صورت میں داماد اگر دور اندیش اور چرب زبان ہو تو پھر ؎

رات کو تھوڑی سی پی صبح کو توبہ کرلی

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

کے مصداق موقع محل دیکھ کر ساس کے آگے بہو کی برائیاں اور بہو کے روبرو ساس کی بدگوئی کر کے اپنا اُلّو سیدھا کر لیتا ہے۔

اب تک جن کرداروں پر روشنی ڈالی گئی وہ لیڈنگ یعنی مرکزی کردار تھے البتہ جن کرداروں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ان کی حیثیت مہمان اداکار کی سی ہوتی ہے کب آئے اور کب گئے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنا یہ معلوماتی مضمون (ہماری نظر میں) ختم کریں، چلتے چلتے ان دامادوں کے لیے ایک خاص مشورہ حاضر ہے جو سسرال میں مستقل اڈہ جمانا چاہتے ہیں۔ یعنی گھر داماد بننا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک اچھا بھلا داماد جیسے ہی گھر داماد بنتا ہے اس کے تمام ستارے گردش میں آجاتے ہیں، اس سلسلے میں ایک لطیفہ سنیئے"۔۔۔ ایک صاحب سے کسی نے پوچھا۔ قبلہ آپ نے اتنے برسوں پرانے نوکر کو کیوں نکال دیا۔ جواب میں وہ بولے۔ اب ہمیں نوکر کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے داماد مستقلاً ہمارے ہاں آگئے ہیں۔۔"

اسی لطیفہ پر قصہ سسرال، عرف جی کا جنجال ختم ہوا۔!!!



مکاں سے لامکاں تک

اس مضمون کا تصوف سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اگر کسی نے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی تو نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔۔۔۔۔۔

جس گھونسلا نما مکان میں کسی بے بال و پر پنچھی کی طرح ہم پچھلے پانچ برس سے رہتے چلے آئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جس گھونسلے میں پورے پانچ برس تک دھوپ میں سوکھتے برسات میں بھیگتے اور سردی میں ٹھٹھرتے رہے اُسے مکان دار نے ہمیں قطعی اندھیرے میں رکھ کر اچانک ہی ہراج کرنے کا فیصلہ فرما دیا۔ ویسے ہم جس دن سے اس گھر میں منتقل ہوئے تھے اُس دن سے لے کر بے گھر ہونے تک ہر بات کے تعلق سے اندھیرے میں رہے ہیں۔ بلکہ اب تک اندھیرے میں ہیں۔ اُس مکان کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ لاکھ چراغ قندیل جلانے پر بھی ہمیں کبھی اجالے کا احساس نہیں ہوا۔ رات تو خیر رات ہے کبھی کبھی تو دن میں بھی ہمیں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اکثر ہم ڈرائنگ روم کے دھوکے میں باتھ روم میں اور کچن کے دھوکے میں بیت الخلاء میں جا پہنچے۔ غالباً جس انجینئر نے اس گھر کا نقشہ بنایا ہے وہ آنکھ کا نہیں تو عقل کا اندھا ضرور رہا ہوگا۔ اُس گھر کو ہم دنیا کا آٹھواں عجوبہ سمجھتے تھے۔ ویسے اُس مکان میں منتقل ہونے کے دوسرے ہی دن سے ہم نے کسی دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی تھی۔ لیکن مکانوں کی قلت کے اس دور میں موزوں و مناسب مکان ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بلکہ اگر عاشقِ نامراد فرہاد کو ہماری کو جوئے شیر لانے کے بجائے کسی موزوں و مناسب کرائے کے مکان ڈھونڈنے

کے لئے کہا جاتا تو وہ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ذرا سے تصرف کے ساتھ کچھ یوں ترنم سے پڑھتے ؏

یہاں ٹھیری جو شرط وصلِ شیریں ٭ تو پھر استغفار میرا باحسرت و یاس

چنانچہ ہمیں بھی چار و ناچار صبر کرنا پڑا۔ ویسے بھی مجبوری کا دوسرا نام ہے صبر اور صبر کا پھل غالباً قبر میں ملتا ہے۔ اور ہمارا گھر قبر سے کب کم تھا۔ چنانچہ صبر کرتے رہے اور اس صبر کا پھل کچھ یوں ملا کہ آہستہ آہستہ اس گھر سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ اس نادر الوجود مکان کے آگے ہمیں کنگ کوٹھی بھی ہیچ معلوم ہونے لگی، جیسے چار مینار کے آگے چار کمان۔ چنانچہ ہم نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ اس مکان کو مرتے دم نہیں چھوڑیں گے۔ بلکہ یہ وصیت کر جائیں گے کہ مرنے کے بعد ہمیں اسی مکان میں دفن کیا جائے اور پھر ہمارا شاندار مقبرہ بنوایا جائے لیکن فلکِ ناہنجار کو ہمارا اس گوشۂ عافیت میں رہنا ایک آنکھ بلکہ دونوں آنکھوں نہ بھایا۔ کم بخت مکان کی چھدری چھت کے ذریعہ ہمیں دن رات ہر عالم دیکھا کرتا تھا۔

کہتے ہیں فلک ناہنجار جس کے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑ جاتا ہے پھر اُسے صفحۂ ہستی سے جھاڑ کر ہی دم لیتا ہے۔ وہ تو غنیمت کہ اُس نے ہمیں صرف گھر سے ہی جھاڑ پھینکنے پہ اکتفا کیا ہمیں اِس گھر سے بے گھر ہونے کا بہت قلق ہے۔ برسات کے موسم میں ہم بارش کا زہر لطف اُٹھاتے، آسمان اگر دو گھنٹے برستا تو ہماری چھت چار گھنٹے ٹپکتی نتیجتہً گھر کا کونہ کونہ حسین ساگر میں تبدیل ہو جاتا اور ہم اپنی کھٹیا کو کشتی کی طرح کھیتے ہوئے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جاتے۔ اُس گھر کی بدولت ہم کشتی رانی کے فن میں ماہر ہو چکے ہیں۔ رات میں جب کبھی نیند ہمیں نخرے دکھاتی ہم اُسے منا کر اُس کا دماغ خراب کرنے کے بجائے کھٹیا پر پڑے پڑے چھدری چھت کے اُس پار آسمان کے وسیع آنچل میں ٹنکے دن گنت تارے گن کر ساری ساری رات بتا دیا کرتے چنانچہ اِس گھر کی مہربانی سے ہم فلک کے تمام تارے، سیارے کئی بار گن چکے ہیں۔ نہ صرف رات میں بلکہ دن میں بھی۔ جب بھی کوئی

گھر کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹاتا، ساری دیواریں یوں ہلنے لگتیں جیسے خود آگے بڑھ کر آنے والے کا استقبال بلکہ اس سے مصافحہ و معانقہ کرنا چاہتی ہوں۔ پڑوس میں کسی کے ہاں بھی کپڑے چھانٹے جا رہے ہوں ہماری چھت سُر اور تال کے ساتھ بھانگڑا ناچنے لگتی۔ اب آپ ہی کہئے ایسے نادر الوجود بلکہ اُمّ العجائب گھر سے جدا ہونے کا دکھ کیوں کر نہ ہوگا۔ اگر مکاندار صاحب پہلے ہی اپنے اس خطرناک ارادے سے آگاہ کر دیتے تو ہمیں اتنا دکھ نہ ہوتا۔ ہم اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس سانحہ کیلئے تیار کر لیتے۔ لیکن انہوں نے تو ہمیں جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔ اور اچانک ہی ہراج کا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ہم اس ہنگامے سے صرف دو دن پہلے ان کے اس خطرناک ارادے سے واقف ہوئے۔ وہ بھی بہ ذریعہ اشتہار، ایک تو کاغذی اشتہار تھا جس پر مکان کا نقشہ و دیگر تفصیلات درج تھے۔ اور دوسرا اشتہار وہ تحریر تھی جو ہمارے مکان کی دیوار پر جلی حرفوں میں آویزاں ہمارا منہ چڑا رہی تھی ہمیں ویسے غصہ بہت کم آتا ہے مگر دیوار پر آویزاں تحریر کو دیکھ کر جو خصوصیت سے صرف ہمارا ہی منہ چڑا رہی تھی۔ ہم ہتے سے اکھڑ گئے۔ لیکن ہمارے دوست احباب نے یہ کہہ کر ہمیں واپس ہتے پر بٹھا دیا کہ ہم صرف کرایہ دار ہیں مالکِ مکان نہیں ——— مکان مالک کا ہے چاہے ہراج کرے یا ڈھا دے۔ ——— بہر حضور! ہراج شروع ہوگیا۔ مکان سے ملحقہ چبوترے پر ہراج کمپنی کے کارکن اسپیکر وغیرہ لے کر جم گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے محلے کے تقریباً تمام شریف بدمعاش بچے بڑے سبھی اکٹھے ہوگئے ہر شخص مکان کو کم اور ہمیں زیادہ گھور رہا تھا۔ گویا ہراج مکان کا نہیں بلکہ ہمارا ہونے جا رہا تھا لوگوں کی نظروں سے یہ خطرناک ارادہ بھانپ کر ہم مکان کے اندر روپوش ہوگئے۔ باہر کمپنی کا ایجنٹ مکان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ یوں تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا جیسے اس مکان کے آگے کنگ کوٹھی، فلک نما پیالس بلکہ تاج محل بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے، مکان کے محل وقوع کی کچھ اس طرح تشریح کر رہا تھا جیسے اس کے شمال میں کشمیر

جنوب میں اوپر مغرب میں سوئیزر لینڈ اور مشرق میں مری کا برفانی علاقہ ہے۔ جب کہ حقیقتاً اُس مکان کی پچھلی طرف گھوڑ، دائیں طرف بلدیہ کا گٹر، دوسری دونوں سمتوں میں دو کچے آسیب زدہ مکان تھے۔ ایجنٹ بار بار یہ جملہ دہرا رہا تھا۔ شریف پڑوس خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے۔ اور ہم پڑوسیوں اور اُنکے بچوں کی شرافت کے متعلق سوچ کر ہی بید کی مانند کانپنے لگے، پتنگوں کے زمانے میں یوں لگتا تھا جیسے چھت پر گھوڑ دوڑ ہو رہی ہو اور وہ کویلو جو برسات اور دیگر موسمی حادثات کی زد میں آنے سے کسی نہ کسی طرح بچ جاتی تھی، اس گھوڑ دوڑ کی نذر ہو جاتی، پڑوس میں جب بھی کسی کے ہاں کچھ اچھا بُرا پکتا اگلے دن ہمارے آنگن میں پڑی ہوئی ہڈیوں وغیرہ سے ہمیں پتہ چل جاتا۔ اُدھر مکان کی قصیدہ گوئی میں بریک لگ گیا۔ اور کچھ توقف کے بعد ایجنٹ صاحب اندر تشریف لائے اور بولے ایک ذرا آپکو تکلیف ہوگی۔ زنانے کو کسی ایک کمرے میں ہٹا دیجئے۔

کس کے زنانے کو ہم نے حیرت سے کہا

"آپ کے زنانے کو، یعنی آپ کے بال بچوں کو" ایجنٹ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا"...

"قبلہ! جہاں تک بال بچوں کا تعلق ہے۔ بال تو سر پر سلامت ہیں اب رہے بچے تو وہ ابھی تک عالمِ امکان سے عالمِ وجود میں نہیں آئے۔ بلکہ گمان غالب ہے کہ بچوں کی ماں بھی شاید ابھی تک عالمِ وجود میں نہیں آئی ہیں۔!

"گویا آپ ابھی تک کنوارے ہیں تعجب ہے؟"

اس میں تعجب کی کیا بات ہے قبلہ اس مکان کو دیکھتے ہوئے کوئی اندھا بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دینا پسند نہیں کرے گا...

"یہ آپکا ذاتی معاملہ ہے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں" ایجنٹ گڑبڑا گیا" خیر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو میں کچھ خواہشمند حضرات کو مکان کی ایک جھلک دکھلا دوں" ہمیں بھلا کیا اعتراض

ہو سکتا تھا۔ ہم نے سوچا کیا عجب کہ اسی بہانے کسی لڑکی کے باپ کو مکان کے ساتھ ہم بھی پسند آجائیں۔ کچھ توقف کے بعد ایک جمِ غفیر اندر گھس آیا۔ اور پھر جھلک کے نام پر مکان کا مکمل ومفصل جائزہ شروع ہوگیا۔ ایک صاحب نے باتھ روم کا بہ نظرِ غائر جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کسی قدر چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اور نل کی ٹونٹی کافی اونچائی پر ہے۔ میں سمجھتا ہوں بیٹھ کر نہانے میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ ہم نے فوراً جواباً عرض کیا میں تو ہمیشہ کھڑے ہو کر نہاتا ہوں اور جب کھڑے کھڑے تھک جاتا ہوں تو نل کے اونچے پائپ سے لٹک جاتا ہوں۔ اس طرح خاصی ورزش بھی ہوجاتی ہے۔ البتہ آپ چونکہ مجھ سے کافی چھوٹے ہیں اس لئے بآسانی بیٹھ کر نہا سکتے ہیں، لیکن سردیوں میں آپکو بھی کھڑے ہو کر بلکہ لٹک کر نہانا پڑے گا ورنہ ٹونٹی سے نکل کر آپ تک پہنچتے پہنچتے پانی یقیناً برف بن جائے گا۔۔۔!

لیکن وہ صاحب ہمارے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ فوراً ہی جامے سے باہر ہونے لگے وہ شاید بہ نفسِ نفیس خود نہا کر اپنا شک دور کرنا چاہتے تھے۔ انہیں باتھ روم میں چھوڑ کر بقیہ احباب کے ساتھ ہم بھی دوسری طرف چلے آئے۔ ایک اور صاحب باورچی خانے کی طرف باز کی طرح جھپٹے۔ اور پھر اونٹ کی طرح گردن اندر ڈال کر بھرپور جائزہ لینے کے بعد گدھ کی طرح ہماری طرف پلٹے۔ اور اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتے ہم نے فوراً عرض کیا قبلہ کہنے کو تو یہ باورچی خانہ ہے، لیکن سچ پوچھئے تو یہ ایک ایسا خانہ ہے جس میں باورچی کیا باورچی کا بچہ بھی نہیں سما سکتا۔" جواب میں وہ مسکرا کر بولے۔ میرا باورچی اس قدر مختصر ہے کہ ہر خانے میں بہ آسانی فٹ ہو سکتا ہے۔ البتہ اس باورچی خانے میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ دھوئیں کی نکاسی کے لئے کوئی معقول راستہ نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں اتنا معقول راستہ دیکھیے" ہم نے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "دھواں اس دروازے سے نکل کر دالان میں سے ہوتا ہوا اُس کمرے میں سے گزر کر بہ آسانی دیوان خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ البتہ وہاں پہنچنے کے بعد اگر موڈ میں ہوا تو روشندان اور کھڑکیوں کے ذریعے

باہر پرواز کر جاتا ہے۔ ورنہ دیا گلنے کی دھواں دھواں فضا آنکھوں کے آگے کشمیر یا دوبئی کی دھواں دھواں وادی کا نقشہ کھینچ دیتی ہے۔ بشرطیکہ دھوئیں کی وجہ سے آپ کی آنکھیں نہ جل رہی ہوں۔

اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ باہر سے اندر کی دھواں دھواں فضا کو دیکھ کر کچھ ہمدرد قسم کے پڑوسیوں نے فون کر کے فائر انجن کو بلوالیا ہے" ایک اور صاحب جو چہرے مہرے سے آرٹسٹ بلکہ ماڈرن آرٹ کے پجاری لگ رہے تھے، اندر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "غالباً یہ ڈرائنگ روم ہے"۔

"جی ہاں" ہم نے اثبات میں سر ہلا کر کہا" اس کمرے میں بیٹھ کر میں نے کئی ایسے نادر و نایاب ڈرائنگ کے نمونے تخلیق کئے ہیں جو آج تک خود میری سمجھ میں نہیں آسکے"

ایک صاحب جن کی آنکھیں یا تو نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں یا پھر ان کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی اُن ماڈرن آرٹسٹ کو گھور کر بولے مجھے یہ ڈرائنگ روم نہیں بلکہ بیڈروم لگتا ہے۔ پھر ہم سے مخاطب ہوئے "کیوں صاحب یہاں نیند بہ آسانی آجاتی ہے"

"آپکا بھی خیال درست ہے۔ یہ بیڈروم ہے" ہم نے اِن کے پہلے خیال کی تائید کی۔ پھر دوسرے سوال کا جواب دیا۔ سوائے نیند کے یہاں ہر چیز بہ آسانی آجاتی ہے۔ جیسے مکھی، مچھر، کیڑے مکوڑے، جھینگر، چوہے، مینڈک، بچھو، سانپ وغیرہ ..... !

ایک اور صاحب بول اٹھے، میرے خیال میں یہ دیوان خانہ ہے"

بالکل ٹھیک۔ آپ کا خیال درست ہے۔ ہم نے فوراً انکے خیال کی تائید کی، یہ دیوان خانہ بھی ہے" کیا مطلب" سب نے ایک ساتھ کہا۔ ہم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ یوں کہ جب میں اس کونے میں بیٹھ کر ڈرائنگ کے نمونے تخلیق کرتا ہوں۔

یہ کمرہ میری نظر میں ڈرائنگ روم ہوتا ہے اور جب اس کونے والے پلنگ پر بیٹھ جاتا ہوں تب یہ بیڈ روم بنجاتا ہے اور جب اُس کرسی پر بیٹھ کر کسی شاعر کا دیوان پڑھتا ہوں تو یہ کمرہ دیوان خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب نے مختصر سے بالشت بھر آنگن کو دیکھ کر کہا۔ اس گھر میں آنگن نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ ہم نے اُسی برجستگی سے کہا قبلہ! اس گھر کا آنگن گلی کے اُس پار ہے۔ جو بچوں کے جھولوں، بار، رنگ اور سمنٹ کی پکی بنچوں سے آراستہ ہے"۔ ـــ "آپکا مطلب بلدیہ کے اُس پلے گراؤنڈ سے ہے، وہ حیرت سے بولے۔ جی ہاں، اُسی پلے گراؤنڈ کو ہم اپنے گھر کا آنگن سمجھتے ہیں"۔

ایک اور خواہشمند پاخانے" کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ غالبًا یہ بیت الخلاء ہے"۔ جی ہاں! ہم نے کہا۔ اسی بیت الخلاء کی خلاؤں میں، میں نے اپنے کئی شعر، راکٹوں کی طرح داغے ہیں"۔ وہ ہماری بات اچک کر بولے۔ واللہ کیا واقعی! پھر تو میرے روکھے پھیکے شعروں میں بھی جان پڑ جائیگی۔ پورا گھر نہ سہی لیکن بیت الخلاء کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ اور پھر وہ جیب سے نوٹ بک اور کان کے پیچھے سے قلم نکال کر بیت الخلاء میں تیزی سے غائب ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد کا نظارہ مت پوچھئے! باتھ روم، بیت الخلاء، باورچی خانہ غرض ہر جگہ کیو لگ گیا۔ اور بولی لگنی شروع ہوگئی۔ ہر بولی ہمارے حق میں بندوق کی گولی ثابت ہو رہی تھی۔ اسی چیخ و پکار کے دوران کسی کی کھسر پسر کی بھنک ہمارے کانوں میں پڑی ؛

ایک صاحب کسی سے کہہ رہے تھے مجھے تو یہ مکان آسیب زدہ معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے صاحب بولے۔ یہ آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں"؟

وہ صاحب ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ذرا اس موجودہ کرایہ دار کی ہیئت ملاحظہ فرمایئے لگتا ہے۔ ان پر کسی بھوت یا چڑیل کا سایہ ہے۔ کسی دوسرے

صاحب نے ٹانگ اٹھائی۔ قبلہ! مجھے تو یہ خود بھوت نظر آتے ہیں:

● ایک اور صاحب نے ایجنٹ سے پوچھا: کیا یہ مکان مکینوں سمیت ہراج ہو رہا ہے۔ ادھر ہم خطرے کی بو اچھی طرح سونگھ چکے تھے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ ہمیں اپنے مختصر سامان سمیت نیلام پر اٹھا دیا جاتا، اپنا بوریا بستر بغل میں دبا کر وہاں سے ایسے غائب ہوئے جیسے گنجے کے سر سے بال۔!!



فری اسٹائل اشتہار بازی

ہمارے ایک شناسا کے ہاں ، انگریزی ، اُردو دونوں اخبار آتے ہیں ہم نے ان سے ایک بار پوچھا خبریں تو دونوں اخباروں میں تقریباً وہی ہوتی ہیں ، پھر آپ دو ، دو اخبار منگوانے کی حماقت کیوں کرتے ہیں ۔ جواب میں وہ ہنس کر بولے ۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا خبریں تو دونوں اخباروں میں تقریباً وہی ہوتی ہیں لیکن اُردو اخبار کی خصوصیت ہیں اشتہار جس نرالے ڈھنگ سے اُردو اخبار اشتہار دیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں ۔ نمونے کے طور پر انہوں نے ہمیں اخبار کا وہ مخصوص صفحہ دکھایا جو عموماً اشتہاروں سے بھرا ہوتا ہے قارئین کی تفریحِ طبع کے لئے ہم اخبار کا یہ مخصوص صفحہ اپنے رنگ میں درج ذیل کرتے ہیں ۔

کالم اموات و پیدائش

انتقالِ پُرملال

• افسوس صد افسوس ہماری ساس صاحبہ نے کل رات اچانک اتنی آہستگی سے داعیٔ اجل کو لبیک کہا کہ داعیٔ اجل بھی ٹھیک سے نہیں سن سکا ۔ اور کوئی دو گھنٹے تک دونوں میں ٹھنا ٹھنی چلتی رہی بہت ممکن تھا کہ ہماری ساس صاحبہ داعیٔ اجل کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہوجاتیں لیکن قدرت کو چونکہ یہ منظور نہیں تھا اس لئے

● آخر کار فتح کا سہرا دائیٔ اجل کے سر بندھا۔ مرحومہ کی عمر صرف ایک سو دس برس تھی کسے یقین تھا کہ وہ اس کمسنی میں داغِ مفارقت دے جائیں گی۔ یہ بھی کوئی عمر تھی مرنے کی، یہ تو کھیلنے کھانے کے دن تھے لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہو سکتا ہے بقول شاعر ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے (غالباً یہ بھی دستکاری قسم کی کوئی چیز ہے)
آج وہ کل تمھاری باری ہے

مرحومہ کی وجہ سے گھر میں ایک رونق تھی، گہما گہمی تھی، چہل پہل تھی، اٹھا پٹک تھی اس عمر میں بھی مرحومہ بہ آسانی اپنی تین درجن بہوؤں اور بہوؤں کی بہوؤں کے ناکوں چنے چبوا دیتی تھیں۔ ان کی کس کس بات کو یاد کریں۔ کس کس کا رونا روئیں خدا وند تعالیٰ سے التماس ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے گوشۂ عافیت میں جگہ دے تاکہ اُسے بھی پتہ چلے کہ ہمارے ہوش و حواسِ خمسہ پر کیا گزر چکی ہے۔ اور ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے ہم سے زیادہ ہمارے سسر صاحب کو کہ جن کی عمر صرف ایک سو بیس برس ہے۔

● افسوس پرسوں شب ہمارا پیارا طوطا ہم سب کو روتا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے اُڑ گیا۔ ہمارے گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ علی الصبح نو بجے وہی ہم سب کو جگاتا تھا، اور شام میں چراغ روشن ہوتے ہی لوریاں سنا کر ہمیں سلاتا تھا۔ ہمیں ڈر ہے ہماری بوڑھی نانی کہیں اس صدمۂ جانکاہ سے اپنی جان سے نہ ہاتھ دھو بیٹھیں۔ انہیں ہمارے سوا سو سالہ نانا کی بے وقت موت کا بھی اتنا غم نہیں ہے۔

سچ ہے وہی تو انہیں نماز کا وقت ٹل جانے کے بعد نماز کی یاد دلاتا تھا کہتا بی بی اٹھو، وضو کرو، قضا نماز پڑھو۔ ہائے اتنے پیارے، فرماں بردار ہوشیار طوطے کا نعم البدل اب نہیں مل سکتا۔ !!!

کالم پیدائش
خوشخبری

• یہ خبر سب کے لئے یقیناً خوشی کا باعث ہوگی کہ ہماری خالہ ساس کی خلیری نند کی خالہ ساس نے پرسوں صبح ۶ بجے فارغ البال کے نرسنگ ہوم میں ایک ننھی منی لڑکی کو جنم دیا۔ جب ان کی ساتوں بہنیں کی طرح صحت مند و ہونہار بچی خوبصورت اور تندرست پیدا ہوئی ہے۔ خداوند تعالیٰ بچی کو عمر و اقبال ترقی دے۔ اور ماں کو بار بار ایسی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔

(آمین)

کالم تلاش گمشدہ

• پچھلے ہفتہ بھر سے ہمارے والد صاحب لاپتہ ہیں۔ موصوف کا حلیہ حسبِ ذیل ہے۔

رنگ دھوپ میں سانولا نظر آتا ہے۔ اور چھاؤں میں کالا داڑھی کا بھی یہی حال ہے، دھوپ میں بھوری نظر آتی ہے اور چھاؤں میں سفید، موصوف کی عمر ویسے ستّر برس کی ہے مگر جب سینہ تان کر چلتے ہیں تو پچاس پچپن کے معلوم ہوتے ہیں اور جب کسی قدر جھک کر چلتے ہیں تو اسّی برس کے اور جب بیٹھے ہوں تو کسی بچے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ لقوے کی وجہ سے برابر بات نہیں کر سکتے۔ جس کسی کو جہاں کہیں کھڑے ہوئے یا پڑے ہوئے نظر آئیں برائے مہربانی قریبی تھانے سے رجوع کریں۔

نوٹ:۔ اخراجات سواری وغیرہ بذمہ تلاش کنندگان ہوں گے۔

• میری پیاری بیوی کی پیاری بلّی کھو گئی ہے، جس کی وجہ سے گھر کا سارا سکون ساری خوشیاں دوبارہ لوٹ آئی ہیں۔ عوام الناس سے التماس ہے کہ اگر کسی کو مطلوبہ بلّی کہیں نظر آ جائے تو برائے مہربانی کسی دور دراز جانے والی ٹرین یا بلین میں سوار کر دیجئے۔ شکریہ! پیشگی شکریہ...!

بلی کا علیہ حسب ذیل ہے۔
سفید رنگت پر بھوری دھاریاں دو مکار آنکھیں، ایک چپٹی ناک، سوئیوں سی نوکیلی مونچھیں اور ایک خاص بات نوٹ کیجئے۔ بلی کی مادری زبان میاؤں میاؤں ہے یہ دیگر زبان کا علم نہیں...!!!

کالم ضرورت رشتہ۔

● ایک نہایت ہی کمسن یعنی صرف پینتیس سالہ حسین وجمیل، عقیل وشکیل لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ درخواست گزار میں اِن خوبیوں کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ کھانا بنانا، جھاڑو لگانا، کپڑے دھونا، استری کرانا، سینما کے ٹکٹ بک کروانا، کینسل کروانا، بیوی کی سہیلیاں اور دوستوں کی خاطر مدارت بلا چون و چرا کرنا اس کے علاوہ بچوں کی پرورش و پرداخت جیسے انہیں نہلانا دھلانا، شوشو کرانا، لوری سنا کر سلانے جگنے والے حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔

نوٹ:۔ لڑکی چونکہ دوبار کی طلاق یافتہ ہے اس لئے صرف تجربے کار اور مطلقہ حضرات ہی رجوع فرمائیں۔

● رشتہ درکار ہے ایک ولایت پلٹ نیم حکیم کے لئے جس کی عمر صرف چالیس سال ہے۔ اور آمدنی بے حد و بے حساب ہے۔ چونکہ انکم ٹیکس کی طرف سے آج کل بہت دھاڑ پڑ رہی ہے اس لئے ہم آمدنی کو فی الوقت صیغہ راز میں رکھنے پر مجبور ہیں لڑکی کا کمسن خوب صورت اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی کے سارے طور طریقوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اور ہر قسم کے انگریزی ڈانس سے واقفیت ایڈیشنل کوالیفکیشن تصور کی جائے گی۔ خصوصاً "بال روم ڈانس"، "بیڈ روم ڈانس" اور "باتھ روم ڈانس" میں مہارت رکھنے والی لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔

● ایک ساٹھے یا ٹھے ساٹھ سالہ مرد کے لئے نکاح ثانی کی ضرورت۔ تعلیم تربیت،

ذات پات دھن دولت کی کوئی قید نہیں۔ صرف لڑکی کا کمسن ہونا ضروری ہے البتہ مضبوط اعصاب والی لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی اللہ رکھے گرہستی بہت بڑی ہے۔ پہلی چار بیویوں سے تیرہ لڑکے گیارہ لڑکیاں ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی کی عمر سوا برس ہے۔۔!!

متفرق اشتہارات۔

● مہربان قدردان ایک نظر ادھر بھی۔ آج ہوا کا رخ بدل چکا ہے جسے دیکھئے پریشان ہے، بیوی ناراض شوہر بیزار، بچی نافرمان بچہ اوباش، بوڑھے ساس وسسر عذاب جان بہو منہ پھٹ، کسی کو اولاد کی آرزو کوئی کثرت اولاد سے نالاں، بیٹا بیٹی کی شادی دشمن کی بربادی۔ غرض کوئی مسئلہ کوئی الجھن ایسی نہیں جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ کہتے ہیں مایوسی کفر ہے اس لئے آج ہی اپنی پہلی فرصت میں مشہور عامل بابا گنڈے شاہ عامل لنگوٹی والے سے ملئے۔ موصوف کے سلیمانی، نورانی، شیطانی، زنانی، مردانی تعویذ پلیتے آج ایک خلقت کو فیض پہنچا رہے ہیں۔

پتہ:۔ لنگوٹ محل، اندھا کنواں منگل کی ہاٹ۔

● صاحبان قدرداں

صرف ایک نظر۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
سب کی حاجت روا کریں گے ہم

کون نہیں چاہتا کہ دھندے کاروبار میں ترقی ہو۔ مرضوں سے نجات ہو، قرضوں سے چھٹکارہ ملے، لیکن یہ سب مقدر کی بات ہے، ستاروں کی گردش پر منحصر ہے مگر بُرے ستاروں کی گردش بدلی جاسکتی ہے اگر یقین نہیں آتا تو مشہور عالم نجومی حضرت غیب دان،

غیب نگری سے ملئے جو ہاتھ دیکھے بغیر حال، جُوہ دیکھے بغیر بال، اور پاؤں دیکھے بغیر چال، بتا دیتے ہیں۔ بس آزمائش شرط ہے۔

پتہ :- جوتش نگر، بجوی گلی، بابا جال بلڈنگ فلیٹ نمبر ۴۲۰۔!!

• بے روزگار نوجوانو!

صابن بنانا سیکھو، ہر قسم کے صابن، بال بڑھانے والے، بال گرانے والے، کالوں کو گورا کرنے والے، گوروں کو کالا بنانے والے۔ اس صنعت میں ترقی کے کافی امکانات ہیں۔ مزید معلومات کے لیے مشہور ماہر فن جگ مگ داس صابن والا کی عالمی شہرت یافتہ کتاب "دولت کی کنجی" عرف "صابن کی ٹکیہ" مطالعہ کیجیے۔

• مسالے مزیدار مسالے۔ ذائقہ دار مسالے! آپ کی ہانڈیوں کی زینت۔ شیخ چاند اینڈ کمپنی ان لیمیٹیڈ۔ کے مسالے سر بہ مہر ہانڈیوں میں بند خالص مسالے شہر کے ہر بھڑ بھونجے سے طلب کیجیے۔۔!!

نوٹ :- دھوکہ بازوں سے ہوشیار، جب بھی ہمارے مسالے خریدیں ہمارا مخصوص ٹریڈ مارک "ہانڈی اور ڈولی" دیکھنا نہ بھولیں۔

• ضرورت ہے ایک آیا کی۔

جو کالی کلوٹی بدصورت ہو۔ قد کی چھوٹی موٹی، نکٹی چپٹی بے ڈھب بے ڈول ہو۔ اور گھر کے بچوں کے ساتھ مردوں کی بھی دیکھ بھال کرنا بخوبی جانتی ہو، تنخواہ کا فیصلہ بالمشافہ ہوگا۔ البتہ یہ بات نوٹ کی جائے، جتنی زیادہ بدصورت ہوگی اتنا زیادہ مہنگائی الاؤنس دیا جائے گا۔

پتہ :- پوسٹ بکس نمبر ۴۲۰۴ "اخبار گڑھے مردے" !

• افتتاح شاندار افتتاح۔

"ہوٹل عالی شان" کا افتتاح عزت مآب وزیر داخلہ تنزی چرنجی لال ڈاگلہ کے ہاتھ سے کیوں کہ وزیر موصوف ٹوٹے ہیں۔ یاد رکھئے ہوٹل عالی شان آپ سب کے شایانِ شان ہے۔ یہاں پر آپ کو مغلئی، انگریزی، چینی، جاپانی، انسانی، حیوانی ہر قسم کے نیشنل اور انٹرنیشنل کھانوں کے علاوہ ہمارے مخصوص پکوان جیسے مرغ کی کلیجی، کبوتر کا دل، فاختہ کی زبان، تیتر کے گردے، بٹیر کا بھیجہ ہر وقت تیار ملیں گے اس کے علاوہ چنومیاں کی دال اور ننھومیاں کی چینی فری۔

بس آزمائش شرط ہے ایک بار تشریف لائیے اور بغیر راکٹ کے چاند پر پہنچ جائیے......

• قوالی اور مجرا ڈانس کا ملا جلا ڈونغلہ پروگرام۔

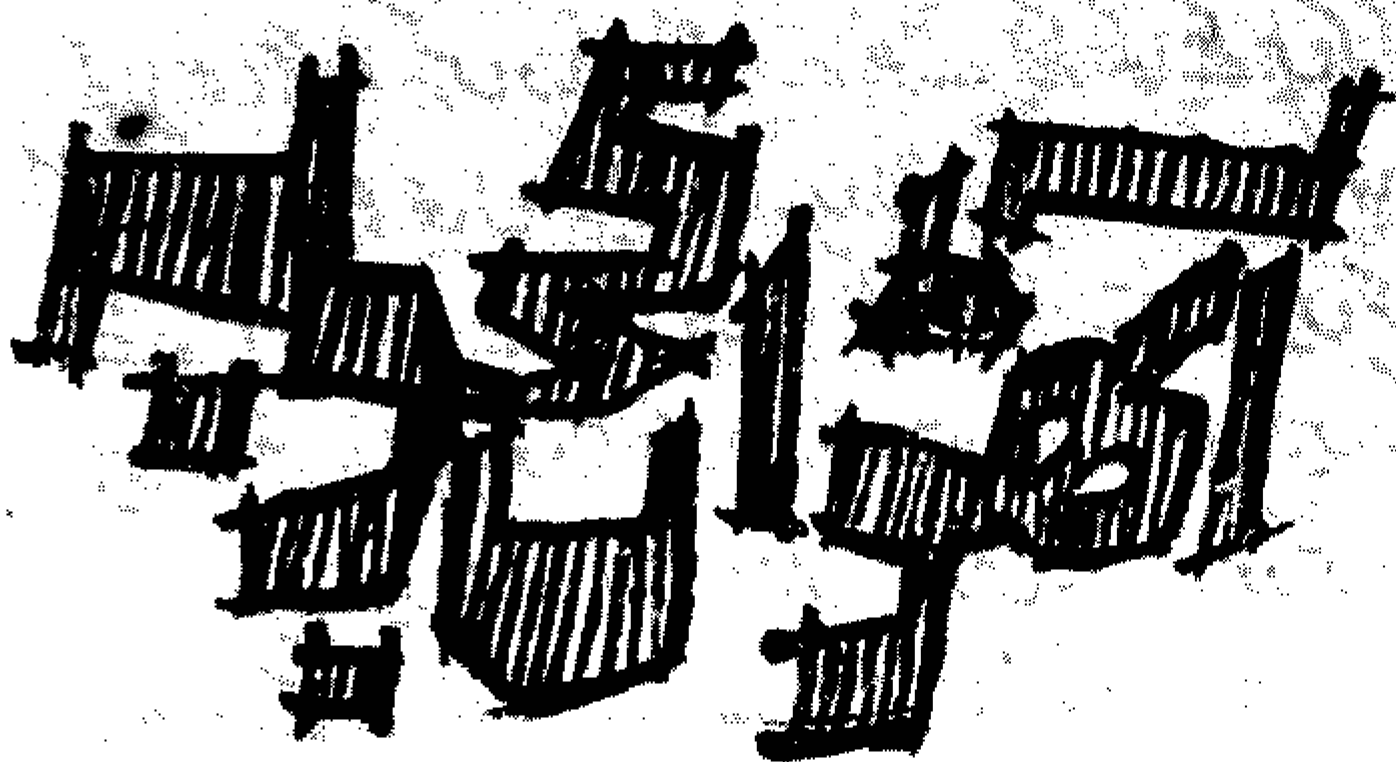
عالمی شہرت یافتہ ملکہ قوالی قتیلہ بانو بھوبنچالی اور شہزادۂ قوال ککن پھاڑ جینجالی کے مابین فری اسٹائیل مقابلہ، یاد رکھئے کل ٹیڑھا آنگن اسٹیڈیم کے تکونی اسٹیج پر طوفان قوالی طوفانِ بدتمیزی کا حیرت انگیز مظاہرہ۔ ساتھ میں "ننگی کا ناچ" کی ماہر فنکاری ڈھکن بالا کا ننگی کا رقص۔ یہ وہی ڈھکن بالا ہیں، جنھوں نے مسلسل دو دن تک رقص پیش کر کے سارے اسٹیج۔ بیم۔ وی ریکارڈ توڑ چکی ہیں۔ آیئے دوست احباب کے ساتھ بیوی بچوں کے ساتھ آیئے۔ اگر کنوارے ہوں تو پڑوسی کی بیوی کے ساتھ آیئے اور ایک ٹکٹ میں دو دو تماشے دیکھئے ــ!!

• طلاق نامہ!

بنام شیخ گھوڑو عرف ننھے صاحب ولد شیخ چاند عرف بنّے صاحب عمر سوا چالیس سال، حال سکونت لاپتہ ذریعہ ہذا تم کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ تم سے میرا عقد

ہو کر ڈھائی سال اور بچہ ہو کر تین سال کا عرصہ ہو چکا ہے، تقریباً دو سال سے تم لاپتہ ہو جس کی بنا پر یہ نوٹس، ذریعہ اخبار مشتہر کر رہی ہوں کہ تم اندر دن پندرہ یوم جہاں کہیں بھی ہو آکر میرا کوئی ایک تصفیہ کریں۔ ورنہ بعد مدت کے میں جو سال بھر پہلے عقد ثانی کر چکی ہوں اس کا باضابطہ اعلان کر دوں گی۔

مسماۃ لاڈلی بیگم عرف پیاری بیگم ولد شیر خاں عرف میر طلخان



> ان بکاؤ نوجوانوں کے نام ۔ آنے والا وقت جنکی مانگ میں سیندور، ناک میں نتھ اور کلائیوں میں چوڑیاں پہنائے گا ۔۔

مسلسل بے کاری اور بے روزگاری سے تنگ آکر ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں لیکن بقول غالب وہ بھی نہ ہوا ۔ جب جب بھی بقول ذوق غم سے گھبرا کر یہ سوچا ہے کہ مر جائیں گے تب تب یہ خیال آیا کہ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے چنانچہ اس بے وفا زندگی سے بقول جگر "مجبوراً نباہ کئے جا رہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پچھلے چار سال سے روڈ انسپکٹری کے عہدے پر فائز ہیں اور گھر کا کھا کر ماموں کی بھیڑ بکریاں چرا رہے ہیں۔ والدین جو کبھی ہمیں اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے تھے اب ہم سے یوں بدکتے ہیں جیسے ہم آنکھ پھوڑ سرمہ کی کوئی سلائی ہوں۔ رشتہ دار لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے اُن کے ذرا سا چوکتے ہی ہم اُن کے برتن بھاڑے لے کر رفو چکر ہو جائیں گے ۔ ہمارے بغیر جن پڑوسیوں کے حلق سے نوالے نہیں اترتے تھے اب ہمیں دیکھ کر نگلے ہوئے نوالے "اگل" دیتے ہیں برسرِ روزگار دوست احباب یوں آنکھ بچا کر نکل جاتے ہیں جیسے کبھی پہچان ہی نہ تھی ۔ سچ کہا ہے کسی نے جب بُرا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے ۔ خدا ہر نوجوان کو اس بے روزگاری کے چکر سے محفوظ رکھے ۔ اِس ننانوے

کرے پڑے ہیں آکر ہم ہر کس و ناکس کے اتنے جوتے چٹخے کھا چکے ہیں کہ کرکٹ کے گیند کی طرح ہماری بھی کھال اتر چکی ہے۔ روزگار کی تلاش میں ہم کہاں کہاں نہیں بھٹکے کس کس امتحان سے نہیں گزرے، لیکن جس آستاں کی ہمیں تلاش ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ یا تو ابھی تک اس آستاں کی بنیاد ہی نہیں رکھی گئی۔ یا پھر ہمارے نصیب میں ہی وہ آستاں نہیں۔ آخر تنگ آکر خودکشی کرنے کی ٹھانی لیکن اس کے لئے بھی ہمت چاہیئے۔ جو ہم میں غالباً شروع سے نہیں ہے، یا اگر تھی بھی تو تلاشِ روزگار کی نذر ہو چکی ہوگی۔ اس کم بخت نوکری کی تلاش میں کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اور اب سوچتے ہیں محاورۃً پاپڑ بیلنے کی بجائے اگر سچ مچ پاپڑ بیلے ہوتے تو آج ہماری حیثیت اس قدر مستحکم ہوتی کہ پچھلے الیکشن میں ہمیں کھڑا کرنے کے لئے ہر پارٹی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی۔ ہمارا نام بھی جھنڈے پر ہوتا ہماری بھی جے جے کار ہوتی۔ پھر ہم بھی نشتر دیش بھگت لیڈروں کی طرح عوام کی جے جے کو لوٹا دیتے اور اپنے لئے صرف "کار" سوئیکار کر لیتے لیکن یہ تو بلی کے خواب میں چوہے والی بات ہے۔ ایک بے کار کے نصیب میں جے جے کار نہیں" ہاہاکار" ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ لیکن ہم کتے سے بھی گئے گزرے ہوگئے اپنی ہی گلی میں یوں منہ چھپائے، نظریں جھکائے داخل ہوتے ہیں جیسے سزایافتہ مجرم ہوں سا گلی محلے کے تمام بچے جو کبھی ہم سے خوف کھاتے تھے، ہمارا ادب کرتے تھے اب ہمیں دیکھ کر فقرے کستے ہیں، ہماری ہنسی اڑاتے ہیں اور آثار بتاتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب یہ فقرے کہ ہمارے پیچھے دوڑیں گے اور کوئی ہمیں بچانے والا بھی نہ ہوگا۔ بلکہ یہ کہنے والا بھی نہ ہوگا، ہائے پتھر سے نہ مارو میرے دیوانے کو۔ گھر گھر پانی ڈالنے والے بہشتی، اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے والے بھنگی جو کبھی

ہمیں دیکھتے ہی فرشی سلام جھاڑا کرتے تھے اب یوں ہماری طرف دیکھتے ہیں جیسے سلام کے سلسلے میں ہماری طرف سے پہل کی امید رکھتے ہوں. کہتے ہیں کہ ماں بھلے ہی مر جائے مگر آس نہ مرے. اور ہماری آس و امید پر نزع کی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی آس و امید کے جنازے کو کندھا دے کر سوئے قبرستان لے جاتے ایک کرم فرما آسمان سے گرے اور ہمارے گھر والے کھجور کے جھاڑ میں اٹکے. پھر ہماری جھولی میں کسی پکے ہوئے آم کی طرح ٹپکے اور یہ مخلصانہ مشورہ دیا کہ آسمان سے باتیں کرتی بلکہ تو تو میں میں کرتی ہوئی مہنگائی میں آپ جیسے تھرڈ کلاس بی. اے پاس کنوارے نوجوان کے لئے ایک ہی منافع بخش سودا ہے. اور وہ ہے کسی ملازمت پیشہ لڑکی سے شادی. . ایک ہی دھکے میں تمہاری پھٹیچر مفلسی، تنگ دستی اور بے روزگاری کے گڑھے سے نکل کر سونے چاندی کی سڑک پر برق رفتاری سے دوڑنے لگے گی۔

ہم نے سوچا کہ یہ خیال ہمیں کیوں نہیں آیا. خیر دیر آید درست آید۔ ہم اُن کے آگے دو زانو ہو گئے. اور اِن کا دامن تھام کر بولے — اے خضر دنیادار آپ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے. اب جب کہ آپ ہمیں مل ہی گئے ہیں ہم اس وقت تک آپکا دامن نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ آپ ہمیں کسی ملازمت پیشہ لڑکی کے گلے نہیں مڑھ دیتے. چنانچہ ہم نے سر تسلیم خم کر دیا کہ اگر مزاج یار میں آئے تو ایک لات ہی رسید کر دیجئے۔ موصوف کا دل شاید موم کا تھا بلکہ موصوف خود موم کے پتلے تھے فوراً پسیج گئے. اور پھر تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ایک اچھے گھرانے میں ہماری بات پکی کر دادی۔ جہیز کی تفصیل سنکر ہماری باچھیں کھل گئیں. ہر چیز دوہری یعنی ڈبل تھی. دو، دو پلنگ، دو، دو بستر، دو دو ریڈیو، دو دو سکوٹر. البتہ جوڑے گھوڑے کی رقم بہت کم تھی. صرف دو ہزار روپے. لیکن لڑکی چونکہ کماؤ تھی اسلئے

ہم نے بلاچوں وچرا اس قلیل رقم کو قبول کر لیا۔ ہمارے والدین جو کبھی ہم سے بے حد نالاں تھے اب ہم پہ ہزار جان سے قربان ہو رہے تھے، اب وہ ہمیں ایک ایسا کھوٹا سکہ سمجھ رہے تھے جو اُن کی تقدیر پہ لگے زنگ آلود تالے کو کھول سکتا ہے، جس جس کی مفلسی اور تنگ دستی کو اپنے ایک ہلکے سے اشارے سے گھر بدر بلکہ شہر بدر کر سکتا ہے۔

جب ہم نے اپنے کرم فرما سے پوچھا۔۔ قبلہ اتنے اچھے گھر میں وہ بھی ایک ما ہر روزگار لڑکی سے ہمارا رشتہ اتنی آسانی سے کیسے اور کیوں کر طے ہو گیا۔ آپ نے کون سا ایسا چکر چلایا ہے۔ ایک تو ہم بے روزگار۔ دوسرے ہماری مالی حیثیت بھی اتنی مستحکم نہیں، تیسرے ہم کچھ اتنے خوبرو بھی نہیں کہ کوئی ہمیں دیکھتے ہی اپنی لڑکی اٹھا کر دیدے۔ موصوف نے پہلے تو ایک قہقہہ لگایا۔ پھر کچھ یوں فرمایا "چکر صرف اتنا ہے برخوردار کہ تمہارے سسرال سے اگر کوئی تمہارے بارے میں کچھ دریافت کرنے آئے تو کہہ دیا کہ بمبئی میں تمہارا اپنا کاروبار ہے۔"

کاروبار۔۔۔۔ وہ بھی بمبئی میں۔۔۔" ہم گڑبڑا کر رہ گئے۔ قبلہ ہم نے تو آج تک بمبئی کی صورت نہیں دیکھی۔ بلکہ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بمبئی شمال میں ہے یا جنوب میں۔"

وہ بولے۔۔ برخوردار بمبئی مغرب میں ہے اور پونا کے آگے۔

ہم نے پوچھا۔ پونا کدھر ہے۔۔۔؟

بولے۔ بمبئی سے پہلے"

اور دونوں۔۔"

"ایک دوسرے کے آگے پیچھے۔۔"

پھر موصوف کے مشورے پر ہم نے کچھ چلتا پرزہ قسم کے پڑوسیوں کو بہ طور

رشوت کے کچھ دے دلا کر سمجھا دیا کہ اگر کوئی اجنبی ہمارے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کرتا ہوا آئے تو ہماری اور ہمارے بزنس کی تعریفوں کے کچھ ایسے پل باندھنا کہ ناٹا دبلا بھی ہمارے آگے پانی بھرتے نظر آئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن بھی آگیا جب ہم سہرے کے بوجھ سے گردن جھکائے، باجے گاجوں کی دھوم اور بدتمیزیوں کے ہجوم میں گھرے ہر راہ گیر کو زبردستی سلام کرتے ہوئے بالآخر درِ محبوب تک پہنچ گئے۔ لوگ بارات کو دیکھ کر یوں محظوظ ہو رہے تھے جیسے کوئی سڑک چھاپ سرکس کمپنی مفت تماشا دکھا رہی ہو۔ لوگ غالباً دور دور سے دوڑ دوڑ کر آئے تھے۔ دلہن کے رشتہ داروں نے بارات کا نہایت ہی شاندار استقبال کیا۔ اور ہم تو خیر نوشہ ہی تھے یعنی نوشاہوں کے شاہ۔ رشتے ناطوں کے سالوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ مسند تک پہنچا دیا۔ قاضی صاحب وہاں پہلے ہی سے تشریف فرما تھے۔ نکاح کی تیاریاں شروع ہو گئیں، لیکن کچھ دیر کے لیے اِن تیاریوں پر پانی پھر گیا۔ ہمارے ماموں صاحب نے مہر کے سلسلے میں حسبِ عادت ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ماموں صاحب کا ریکارڈ رہا ہے جس شادی میں شریک ہوتے ہیں۔ چاہے مدعو کیے گئے ہوں یا طفیلی ہوں، یا بن بلائے مہمان۔ مہر کے سلسلے میں دولہا والوں کو اس قدر ورغلاتے ہیں کہ شادی کی محفل فری اسٹائل کشتیوں کے اکھاڑے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مہر کے سلسلہ میں وہ بزرگانِ دین کے قدم بہ قدم چلنا اپنے اوپر فرض تصور کرتے ہیں اور جہیز تلک وغیرہ کے سلسلے میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ لڑکی آپ کی ہے جو بھی دیں گے اپنی لڑکی کو دیں گے۔ چاہے لاکھوں کا جہیز دیجیے یا کوڑیوں کا۔ البتہ اتنا یاد رہے کہ سسرال میں لڑکی کی آئندہ زندگی خوشگوار بنانے میں جہیز مرکزی رول ادا کرتا ہے جہیز جس قدر زوردار ہوگا لڑکی کی زندگی بھی اتنی ہی خوش آیند ہوگی۔ چنانچہ

کچھ بھاؤ تاؤ اور بحث و تکرار کے بعد مہر کا مسئلہ طے ہو گیا۔ نکاح کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔ لیکن بھو کے پیلے سے دانتوں نے ابھی دو چار لقمے بھی نہ کھائے ہوں گے کہ ہمارے چچا جان نے سب عادت ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہیں جانے کیوں تقریب کے کھانوں میں کچھ نہ کچھ کمی یا زیادتی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ جس کا احساس کچھ اس زور و شور سے دلاتے ہیں کہ بے چارے میزبانوں کا سارا کھایا پیا حرام کر دیتے ہیں چلا کر بولے... بریانی میں اصلی گھی کے بجائے ڈالڈا استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر پھٹکری کی مار۔ مرچوں کے سالن میں اس قدر مرچ اور میٹھے ہیں کہ شکر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ تقریب ہے یا مذاق۔ اس سے پہلے کہ دستر خوان جنگ کا میدان بن جاتا، کچھ سمجھدار لوگوں نے بلکہ پنچو حضرات نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ چچا جان کو چونکہ اس تقریب کا کھانا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔ اس لئے بے چارے صرف دو قشخواب بریانی۔ ایک کٹورا سالن اور ایک سنخواب میٹھا کھا سکے۔ البتہ ہم بیچ بیچ پیٹ بھر کر نہ کھا سکے۔ ایک تو دوہرے یعنی ڈبل جہیز کی خوشی، دوسرے یہ خوف کہ ہمارے ہنفت رنگی رشتہ داروں کی بے جا حرکتوں کی وجہ سے۔ لڑکی والے کہیں ہمیں لے ہیں دم رام نہ لوٹا دیں۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی دلہن کے ایک معمر باریش رشتہ دار جو مولوی لگ رہے تھے جہیز کا سامان دکھانے کے لئے ہمیں اُس کمرے میں تنہا لے گئے، جہاں جہیز کا سامان نہایت ہی سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ دو دو پلنگ؛ دو دو بستر، دو دو الماریاں، دو دو ریڈیو، دو دو اسکوٹر، دو دو پنکھے اس کونے سے لے کر اُس کونے تک جہیز کا سامان بھرا تھا۔ سب سے آخر میں کچھ چھوٹے بڑے مختلف سائز اور رنگ کے بچے بیٹھے ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان بچوں کے بارے میں کچھ پوچھتے، مولوی صاحب بولے۔ برخوردار جہیز کے سلسلے میں جو فہرست

آپ نے بھجوائی تھی۔ اس میں صرف ایک آئٹم کی کمی تھی۔۔۔"

"ایک آئٹم۔۔" ہم حیرت سے بولے۔

"جی ہاں۔ اور وہ آئٹم ہے بچے۔ جب آپ کو ہر چیز ریڈی میڈ اور ڈبل مل رہی ہے تو ریڈی میڈ یعنی پلے پلائے بچے کیوں نہ ملتے"۔ پھر وہ بچوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ "بچو! یہ تمہارے نئے ابا ہیں انہیں سلام کرو۔۔"

نئے ابا۔۔۔ ہم بڑی طرح سٹ پٹا گئے۔ اور تمام بچے ابا ابا کہتے ہوئے چاروں طرف سے ہم پر ٹوٹ پڑے۔ اور ہم نے گھبرا کر بے اختیاری طور پر اپنے والد صاحب کو پکارا، لیکن ہماری یہ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ بچوں نے ہمیں گھیر لیا اور ناچنے لگے۔ اور ہماری آنکھوں کے آگے آدم خور جنگلیوں کا وہ خونی رقص گھومنے لگا جو کسی آدم زاد کو انگاروں پر بھوننے سے پہلے کیا جاتا ہے۔ اُدھر مولوی صاحب نے مزید کہا۔ "جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں آپ کو ہر چیز ڈبل ملی ہے اسی مناسبت سے قدرت کا انصاف ملاحظہ فرمایئے۔ ان میں سے تین بچے آپ کی بیوی کے پہلے شوہر مرحوم کی نشانی ہیں۔

"پہلے شوہر مرحوم۔ ہم دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔

جی ہاں۔ خدا اُس بے چارے کو جنت نصیب کرے، بیوی کا بڑا فرماں بردار تھا۔ سُنا ہے ایک بار آپس میں بڑا جھگڑا ہوا۔ جس کا اُس حساس شخص نے اتنا اثر لیا کہ تیسری منزل سے گر کر آسمان میں پہنچ گیا۔"

آسمان میں"۔ ہم پر زلزلہ طاری ہو گیا۔ اور دوسرا شوہر مرحوم۔ کیا آسمان سے گر کر کھجور میں دفن ہو گیا۔ ہم نے اتنا کہہ کر سر پر پاؤں رکھ کر (جوتوں سمیت) بھاگنا شروع کر دیا۔

مولوی صاحب چلائے۔" اماں دوڑ نا پکڑنا بچ کر جانے نہ پائے اگلے

موڑ پر ہمیں ٹھوکر لگی۔ اور زمین پر آرہے۔ ہماری چیخ نکل گئی۔

غالباً ہماری چیخ سن کر ہی گھر کے تمام افراد ہمارے کمرے میں چلے آئے تھے۔ ہم چونکہ پوری طرح سے ہوش میں آچکے تھے اس لئے اپنے اس ہیبت ناک خواب پر شرمندہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اور تمام لوگ یوں گھور رہے تھے جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں۔ دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔۔!!!





کہتے ہیں "ضرورت" ایجاد کی ماں ہے۔ اور "پیسہ" ایجاد کا باپ، لیکن اسے اسکی نانی نے پالا ہے، اور ایجاد کی نانی ہے "مجبوری"۔ اور ماں، نانی، نواسی اور باپ کے اس اشتراک نے بہت سارے سائنسی تہلکے مچائے ہیں، جن میں سرفہرست ہیں مختلف اقسام کے "بم"۔ ایک بم چاہے جوہری بم ہو یا دستی بم، بہرحال بم ہوتا ہے جسکا نام سنکر ہی اچھے اچھے سورماؤں کا دم نکل جاتا ہے..

جب سے "بموں" کے خاندان میں ایک نئے بم یعنی "لفافہ بم" کا اضافہ ہوا ہے لوگوں کو اپنی موت اپنے سروں پر منڈلاتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "لفافہ بم" یعنی لفافے میں خیریت کے خط کے بجائے موت کا پیغام، سنا ہے لفافہ کھولتے ہی بم کا سیفٹی پیچ کھل جاتا ہے اور پھر لفافے کے ساتھ لفافہ کھولنے والے کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، اور بغیر ٹکٹ اس عالم گرد و گھٹا سے عالم بالا میں منتقل ہو جانا پڑتا ہے۔

دنیا بھر کے اخباروں اور ریڈیو کی خبروں کے بموجب ہزاروں لفافہ بم اپنی تمام تر دہشت ناکیوں کے ساتھ دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے جس کونے میں ہم رہتے ہیں وہ بھلا ان لفافہ بموں کی پہنچ سے کسطرح باہر رہتا۔ بلکہ جو بلا آسمان سے اترتی ہے۔ سنا ہے وہ سیدھے پسماندہ ممالک میں ہی قدم رنجہ فرماتی ہے۔ کیونکہ ایسے ممالک کے باشندے اسقدر نحیف و ناتواں ہوتے ہیں کہ نہ تو ان بلاؤں کے خلاف کوئی احتجاج

کرسکتے ہیں اور نہ ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال۔۔

لفافوں کی نقل و حرکت کی تمام تر ذمہ داری چونکہ "محکمہ ڈاک" پر عائد ہوتی ہے اس لئے ان لفافہ بموں کے حملوں سے محکمہ ڈاک کے عملے میں جو دہشت ناک سنسنی پھیلی ہوئی ہے وہ قدرتی ہے۔ خصوصاً بچارے "ڈاکیوں" کا قافیہ بُری طرح تنگ ہے۔ ایک تو اپنی موت کا دعوت نامہ خود اپنے ہاتھ میں لئے پھرنے کا احساس کہ جانے ان ڈھیر سارے لفافوں میں سے کس لفافے میں بم موجود ہے۔ دوسرے لوگوں کی سرد مہری ملک بھر میں جب سے لفافہ بموں کی دہشت ناک خبر پھیلی ہے، عوام الناس کی اکثریت "ڈاکیہ" کو دیکھ کر یوں سر سے پیر تک کانپنے لگی ہے جیسے وہ "ڈاکیہ" نہیں بلکہ چمبل گھاٹی کا کوئی خونخوار ڈاکو ہو۔ چنانچہ بیشتر اصحاب "ڈاکیہ" کو دیکھ کر بچنے کی کوشش میں سنا ہے دوسروں کے گھروں میں گھس کر نامحرم خواتین کے ہاتھوں پٹ جانا تک گوارہ کر رہے ہیں۔ اور جو بھاگ کر کہیں چھپ نہیں سکتے وہ بارگاہِ خداوندی میں سر بسجود ہو کر یہی دعا کرتے ہیں کہ مالک! زندگی بھر ہمارے نام کوئی لفافہ مت بھجوائیں، اور اگر خدانخواستہ کوئی لفافہ ہمارے نام ہو بھی تو خدا کرے لکھنے والے نے ہمارے بجائے ہمارے پڑوسی کا پتہ لکھدیا ہو۔ ادھر بیچارہ ڈاکیہ، لوگوں کو یوں بچ کر نکلتا دیکھ کر وہ دن یاد کرنے لگتا ہے جب ہر نظر اسکی راہوں میں بچھی رہتی تھی، اور پھر اُسے آتا دیکھکر ہر چہرے پر مسرت یوں ناچنے لگتی تھی، جیسے پردۂ فلم پر "ہیلن" اپنے رقص کا مظاہرہ کرتی ہے۔ لیکن ان لفافہ بموں کو خدا غارت کرے ڈاکیہ کی "خط لے جاؤ" کی ہانک سنکر لوگوں کو اب گویا سانپ سونگھ جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مکینوں کو زمین نگل گئی یا آسمان ہڑپ کر گیا، سچ ہے انسان موت کے معاملے میں ایک حقیر کیڑے سے بھی کم تر ہے۔ دور کیوں جائیں۔ ہمیں ہی دیکھئے، ویسے ہم کوئی دیکھنے کی چیز نہیں ظاہر ہے ہم "ہیلن" یا "ہیما مالینی" نہیں کہ نابینا حضرات بھی ہمیں دیکھنے کی آرزو کرنے لگیں، بلکہ ہمیں تو ہمارے متعلقین بھی ایک

نظر دیکھنا گوارہ نہیں کرتے، اور جو غلطی سے ہمیں ایک بار دیکھ لیتا ہے پھر آخری دم تک توبہ استغفار میں مشغول ہو جاتا ہے۔ خیر لفافہ بموں کی دہشت ناک خبر نے ہمیں ذہنی طور پر اس قدر مفلوج کر دیا ہے کہ خاکی لباس کو دیکھ کر چاہے وہ کسی کے جسم پر ہو یا ہینگر پر لٹکا ہوا ہو ہم یوں لڑکھڑانے لگتے ہیں جیسے پیدائشی نابینا ہوں۔ اور غلطی سے اپنی لکڑی گھر بھول آئے ہوں۔ (واضح ہو کہ ملک کے طول و عرض میں ڈاکیوں کی پوشاک خاکی رنگ کی ہے)

لفافہ بموں کی وجہ سے عوام الناس میں جو بے چینی اور ہراس پھیلا ہوا ہے اُسے دور کرنے کے لئے سنا ہے محکمۂ ڈاک ایسے حضرات کی تلاش میں کوشاں ہے جن پر اس مصرع کا اطلاق ہوتا ہے ؎ مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

لیکن باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے حضرات روپوش ہونے میں ہی اپنی عافیت سمجھ رہے ہیں کہ معاملہ کسی عاشق نامراد یا معشوق طرحدار کے معطر لفافے کا نہیں بلکہ "لفافہ بم" کا ہے۔ اور ایسے لفافے کا مضمون بھانپنے کی کوشش کرنا گویا اپنی موت کو آپ دعوت دینے کے برابر ہے۔۔۔!

اِن لفافہ بموں نے جہاں اتنی دہشت پھیلائی ہے وہیں ایسے ایسے لطیفوں کو جنم دیا ہے جو آپ نے آج تک نہیں سُنے ہونگے۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے گلی میں ایک اچھا خاصا ہنگامہ بپا تھا، جب تحقیقات کی غرض سے ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ہمارے پڑوسی اور ڈاکیئے کے مابین معقول مذاکرہ ہو رہا ہے۔ ایک عدد بھاری بھرکم غیر ملکی پارسل جو ہمارے پڑوسی کے نام تھا وہ اُسے لینے سے انکار کر رہے تھے۔ جب بات بہت بڑھ گئی تو ڈاکیئے نے جھلّا کر کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل تک جو آپ کا نام تھا آج آپ کا نہیں ہے گویا، آپ، آپ نہیں ہیں" ہمارے پڑوسی نے بھی اسی جھلّاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ آپ اگر مجھ سے یہ اعتراف کروانا ہی چاہتے ہیں تو سنیئے! میں واقعی میں نہیں ہوں۔ لہذا جب میں

خود یہ کہہ رہا ہوں کہ میں، میں نہیں ہوں تو آپ کون ہوتے ہیں مجھے، میں ثابت کرنے والے البتہ آپ اگر یہ جاننے پر مصر ہیں کہ میں، میں نہیں ہوں تو پھر کون ہوں۔ تو غور سے دیکھئے میں یہ ہوں۔۔"

انہوں نے فوراً ہماری جانب اشارہ کیا، اور ہم جو کہ اس بھاری بھرکم پارسل کے حجم کو دیکھ کر ہی بے دم ہو گئے تھے، گڑبڑا کر بولے"

"اماں کیا غضب کرتے ہو آپ آخر کس جنم کی دشمنی نکال رہے ہیں۔ حضور والا باپ پوسٹ مین صاحب! آپ خود ہی غور کیجئے میں بھلا یہ صاحب کیسے ہو سکتا ہوں میں تو حضور میں بھی نہیں ہوں بلکہ دیکھئے میں تو یہ ہوں"

ہم نے ایک اور صاحب کی طرف اشارہ کر کے بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال دی اور وہ صاحب ہمارے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے بغل میں کھڑے ہوتے ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "قبلہ پوسٹ مین صاحب۔ میں تو یہ ہوں"۔ اور ان صاحب نے کسی قدر ہشیاری سے کام لے کر پوسٹ مین صاحب ہی کی طرف اشارہ کر کے یہ چکر ہی ختم کر دیا کہ حضور پوسٹ مین صاحب۔ میں تو آپ ہوں۔ لہٰذا یہ پارسل آپ ہی رکھ لیجئے"۔

اس کے بعد سے تو یہ عالم ہے کہ لوگ اپنی ڈاک لینے سے صاف انکار کر رہے ہیں۔ اور بیچارے ڈاکیئے اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کیلئے بغیر کسی آواز کے دیوار کے اس پار ہی سے خطوط پھینک جاتے ہیں، کچھ اصحاب کے بارے میں سنا ہے کہ ڈاکیئے کی آمد کی خبر سنکر دروازے کے عقب میں کرکٹ کے کسی ماہر فیلڈرس مین کی طرح ڈاک "کیچ" کرنے کی غرض سے ڈٹ جاتے ہیں)۔ اور ڈاکیہ کے خطوط پھینکتے ہی اسے ہوا میں کیچ کر کے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پڑوسی کے گھر میں پھینک دیتے ہیں۔ چنانچہ ان نفافہ بموں کی مہربانی سے عنقریب ہماری گلی سے کم از کم دو درجن بہترین فیلڈرس مین دستیاب ہو سکتے ہیں جو دنیا کے کسی بھی برق رفتار بلے باز کا ہٹ کیا ہوا گیند کیچ کر کے اسے آن واحد میں آؤٹ کر سکتے ہیں۔

ہمارے ایک قریبی شناسا نے بتلایا کہ جب سے انکی ساس نے ان لفافہ بموں کی خبر سنی ہے یہ عالم ہے کہ ڈاکیہ کی آواز سنکر اُن کے ہول شروع ہوجاتی ہے اور وہ اسقدر بے قابو ہوجاتی ہیں کہ دوسروں کی جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ لفافہ بموں نے بھی حقیقتاً اتنی دہشت نہیں پھیلائی ہوگی، جتنی کہ ڈاکیہ کی آواز سن کر انکی ساس کی حرکتوں کی وجہ سے گھر میں افراتفری مچتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساس کا نام "لفافہ بم" رکھ دیا ہے۔ ایک جیتا جاگتا لفافہ بم جو نہ تو خود پھٹتا ہے نہ ہی دوسروں کے پرخچے اڑاتا ہے۔ بس کچھ عرصہ کیلئے دوسروں کے ہوش وحواس معطل کردیتا ہے۔

ایک مرتبہ کوئی نامعقول شادی کا دعوت نامہ باہر ہی سے گھر کے اندر پھینک گیا۔ اور شومئ قسمت کے ساس صاحبہ کی نظر اس پر پڑگئی۔ بس پھر کیا تھا ایک چیخ کے ساتھ دورے کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ بدقسمتی سے اس وقت گھر کے سارے مرد باہر تھے۔ بیچاری عورتیں انہیں قابو میں کرنے کی اپنی سی سعی کرکے رہ گئیں۔ لیکن وہ رسیاں تڑاکر ایسی بھاگیں کہ شام میں مردوں کے لوٹنے تک انکا سراغ نہ مل سکا۔ شام کو گھر کے تمام مرد، بوڑھے، بچے انکی تلاش میں نکل گئے۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد تیسرے گھر میں انکے پان کا بٹوہ، پانچویں گھر میں رومال، ساتویں گھر میں چپل اور نویں گھر میں وہ خود ملیں۔ ہمارے شناسا نے مزید کہا کہ اس واقعے کے بعد سے گھر کے بیرونی دروازے پر ایک ڈبہ لگادیا گیا ہے جس پر جلی حرفوں میں یہ تحریر لکھی ہوئی ہے:

"برائے مہربانی خاموشی سے خطوط وغیرہ اس ڈبے میں ڈال دیجئے، کسی قسم کی آواز یا ہانک لگانے سے حتی الممکنہ احتراز کیجئے، ورنہ نتیجے کے آپ خود ذمہ دار ہونگے اس دروازے پر "خط لے جاؤ" کی ہانک لگانا، سوتے ہوئے شیر کو جگانے کے برابر ہے۔

اسی قبیل کا ایک اور لطیفہ سنئے جو کامیڈی سے شروع ہوکر ٹریجڈی پر ختم ہوا۔

ایک ساس صاحبہ لرزتی سانسوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ داماد کے ہاں سے آئے ہوئے پیرلکی بھاری بھرکم پارسل کو کھول رہی تھیں، قریب ہی انکے پوتے بیٹھے جو ہوا بھر رہے تھے کہ اچانک ہوا کا دباؤ بہت بڑھ جانے سے غبارہ ایک آواز کے ساتھ پھٹ گیا۔ جیسے بم کا دھماکہ سمجھ کر بیچاری ساس صاحبہ جو اپنے شوہر کی پیاری تھیں آن واحد میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔"

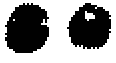
باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے اصحاب جن کی جسمانی ساخت اپنے دشمنوں کو للکارنے میں مانع ہوتی ہے لفافہ بم بنانے والی خفیہ پارٹیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ہیں تاکہ بذریعہ ڈاک موت ارسال کر کے میلوں دور گھر بیٹھے اپنے دشمنوں کا صفایا بھی کر سکیں۔ اور قانون کی زد میں بھی آنے سے بچے رہیں۔!

ایسے وظیفہ یاب حضرات جو شادی بیاہ، غمی خوشی ہر قسم کے دعوت ناموں کے انتظار میں اپنی بقیہ زندگی گزار دیتے ہیں۔ جب سے لفافہ بموں کے بارے میں سنا ہے دعوت ناموں کے لفافوں کو دیکھ کر یوں لرزہ بہ اندام نظر آتے ہیں جیسے یہ دعوت نامہ دراصل موت کا بلاوا ہے جس کے داعی حضرت ملک الموت ہیں۔"

بیویوں کی اکثریت کو چوری چھپے، شوہر نامدار کے نام آئی ہوئی ڈاک پڑھنے یا پڑھوانے کی (ان پڑھ ہونے کی صورت میں) لت ہوتی ہے، اور خصوصاً شاعروں ادیبوں کی بیویوں کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی عورت ان کے گنجے، بدحال، چندصورت شوہر کو ہتیانے کیلئے پیار بھرے طویل و معطر خطوط لکھا کرتی ہے۔ اسی لئے ہر بیوی شوہر کے نام آئی ہوئی ڈاک کو سنسر کرنا اپنا دائمی حق سمجھتی ہے۔ لیکن جب سے لفافہ بموں کا ہنگامہ منظر عام پر آیا ہے۔ بے چاری بیویاں ہر قسم کے لفافے کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر رہی ہیں، گویا "لفافہ بم" کا ہنگامہ اگر کسی کے حق میں سود مند ثابت ہوا ہے تو وہ صرف شاعر و ادیب حضرات ہیں۔۔!

بیشتر پڑھے لکھے بلکہ ڈگری یافتہ اصحاب کے بارے میں سنا ہے کہ ان پڑھوں کی طرح اپنے نام آئے ہوئے لفافے لئے سڑکوں پر ہر کس و ناکس کے آگے گڑگڑاتے پھر رہے ہیں کہ بھائی صاحب بڑی مہربانی ہوگی، ذرا لفافہ ہی چاک کر دیجئے، چٹھی کسی اور سے پڑھوا لوں گا۔"

الغرض ایسے متعدد لطیفے اگر اب تک جنم نہ لے سکے تو انشاءاللہ بہت جلد منظرِ عام پر آجائیں گے، بس ذرا "لفافہ بموں" کی وبا کو اور پھلنے پھولنے دیجئے۔



مہمان بن کے جانا

انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ اپنی دال روٹی سے پرایا حلوہ مانڈا چونکہ مفت کا ہوتا ہے اس لئے کچھ زیادہ ہی بھاتا ہے۔ اور خوش نصیب وہی کہلاتے ہیں جو آئے دن پرایا حلوہ انڈا اُڑاتے رہتے ہیں۔ اور بدنصیب ہیں وہ جو کسی کے مہمان بننے کی حسرت دل میں لئے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے، انجام کار موت کے مہمان بن جاتے ہیں (گویا مہمان بننا ایک ایسا فعل ہے جس سے کسی کو مفر نہیں) اور لگتا ہے ہمارا شمار ایسے ہی بدنصیبوں میں ہونے والا ہے۔ ایک تو مقدر ہی بڑا۔ اس پر ملازمت کی مصروفیات جس طرح نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے اسی طرح نیم سرکاری ملازمت بھی خطرناک اور بے بھروسہ ہوتی ہے۔ جی ہاں! ایک دانہ مقدر حاصل کرنے کے لئے تو کسی راکٹ کی طرح متعلقہ دفتر کے سینکڑوں چکر لگانے پڑتے ہیں۔ جب کہ برطرفی کا آرڈر گھر بیٹھے ہی پہنچ جاتا ہے اور ہماری اس مجبوری سے جاننے انجانے سبھی اچھی طرح واقف ہیں اس لئے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ویسے جہاں تک ہمارا

خیال ہے ہم بھی انسان ہیں۔ (ہو سکتا ہے خیال غلط ہو) سینے میں دل رکھتے ہیں اور دل میں مہمان بننے کی تمنا محفوظ۔ اس لئے کئی بار کوشش کر چکے ہیں کہ کوئی ہمیں کم از کم دو چار روز کے لئے ہی بہ حیثیت مہمان کے جھیلے (اسے کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا) لیکن جب تقدیر میں صرف اوروں کی میزبانیاں لکھی ہوں تو پھر ہر کوشش بے کار ہے۔!

ابھی پچھلے دِنوں کی بات ہے، آئے دِن کی ان میزبانیوں سے تنگ آکر ہم نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ چاہے آسمان سر پر گر پڑے یا زمین پیروں تلے سے سرک جائے لیکن ہم تو کسی کے مہمان بن کر ہی دم لیں گے۔ چنانچہ اس دھن کے سر میں سماتے ہی تگ و دو شروع کر دیں۔ اسی جستجو میں کہ اپنی میزبانی کا شرف بخشیں تو کسے بخشیں۔

سب سے پہلے رشتہ داروں کو کھنگالا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان کے ہاں بہ حیثیتِ مہمان کے پہنچ کر بھی ہماری حیثیت کم و بیش میزبان کی سی رہے گی۔ چنانچہ اِدھر سے مایوس ہو کر قریبی دوست احباب کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ آج کل نہ صرف ان کے ستارے ہی گردش میں ہیں بلکہ وہ خود بھی ستاروں سے دوگنی رفتار میں گردش میں ہیں، یعنی آج یہاں مہمان تو کل وہاں۔ چنانچہ مجبور ہو کر ہمیں ان ستم ظریف احباب کی طرف متوجہ ہونا پڑا جن کے نام تک نہ لینے کی قسم کھائی تھی۔ جن کے ہاتھوں اتنے صدمے اٹھا چکے ہیں کہ ہماری جگہ اگر پہاڑ بھی ہوتا تو اپنی جگہ سے سرک جاتا لیکن مہمان بننے کی اس ضد کا بھلا ہو ہمیں یہ قسم توڑنا ہی پڑی۔ سب سے پہلے مرزا ظریف جو ہمارے حق میں ستم ظریف ہیں ان کا خیال آنا ضروری تھا۔ آپ اپنی کوہ قافی بیگم کے ہمراہ سال میں کم از کم دو بار ہمارے سینہ پر مونگ دلنے کی غرض سے بہ بانگ دہل یعنی اطلاع دے کر پہنچ جاتے ہیں اور ہماری پریشانیاں تو موصوف کے مکتوبِ گرامی سے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ اندازِ تحریر ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

برخوردار! بھلا ہو ان سائنس دانوں کا، اٹم غلم تجربے کر کے فضا کو خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھو ان ہی کی مہربانیوں کا جیتا جاگتا شکار ہوں۔ (الّا ان کہ جناب خود کسی میر شکاری سے کم نہیں) کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے۔ ڈاکٹر نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا ہے۔ اور دفتری مصروفیات ہیں کہ جی بھر کر اُنگھنے تک کی فرصت نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح چار روز کی رخصت اتفاقی لے کر پرسوں شام کی گاڑی سے نکل رہا ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ اس میں آرام سے جگہ نہ مل سکی تو پھر بذریعہ بس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میرے ساتھ حسبِ معمول تمہاری چاچی بھی ہوں گی۔ زیادہ کیا لکھوں تمہاری چاچی تمہیں دعا کہتی ہیں، پچھلی بار بجلی کا پنکھا نہ ہونے کی وجہ سے انھیں تمہارے ہاں کسی قدر تکلیف ہوئی تھی۔ امید ہے اس بار ہمارے پہنچنے تک پنکھے کا بندوبست ہو جائے گا۔ خیال رہے پنکھا ایک دم بے آواز اور تیز ہوا پھینکنے والا ہو۔

زاید اشتیاقِ ملاقات

تمہارا چاچا

مرزا ظریف

مرزا صاحب سے صحیح معنوں میں ہماری کیا رشتہ داری ہے یہ خدا جانے یا خود مرزا صاحب۔ ویسے خود ان کا بیان ہے کہ ان کی ممیری نانی کی خالہ زاد نند اور ہمارے والد صاحب کی خالہ زاد نانی کی ممیری نند آپس میں منہ بولی بہنیں تھیں۔ اور اس حساب سے وہ ہمارے قریبی رشتہ دار ہوئے۔ لہذا ہمیں ان کا ہر ستم سہنا ہے۔ ان کے ہر حکم پر بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ چنانچہ ہم نے پہلے تو سر جھکا کر ایک بے آواز تیز ہوا پھینکنے والے پنکھے کا بندوبست کیا۔ اور پھر علیٰ الصبح جبکہ لوگ گرم گرم نہاری کے مزے لوٹتے ہیں ہم نے ریلوے اسٹیشن کی دھول پھانکی اور جب انتظار کی دھوپ میں تپ کر ہمارا سارا وجود پگھل گیا تب کہیں مرزا صاحب نہایت ہی ہشاش بشاش اپنی بیگم

کی انگلی تھامے ہوئے نظر آئے ۔ مرزا صاحب جسامت کے لحاظ سے ایک دم منحنی مختصر سے آدمی ہیں جبکہ ان کی کوہ قافی بیگم بالکل ان کی اُلٹ ہیں یعنی ایک دم لحیم شحیم ہیں۔ اور ان دونوں کی اس بے جوڑ جوڑی کو دیکھ کر ہمارے ذہن میں ہمیشہ "گلی ڈنڈے" کا تصور جاگ اُٹھتا ہے۔ آپ نے ایسے مہمان شاذ و نادر ہی دیکھے ہوں گے (بلکہ کاہے کو دیکھے ہوں گے) جو میزبان کے بستر، کپڑے، جوتے، صابن، برش، تیل غرض ہر چیز کا کچھ ایسے مالکانہ انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ اگر کوئی نیا آدمی دیکھے تو انھیں گھر کا مالک سمجھے۔ اور اصل مالک کو مہمان۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ جاتے جاتے یہ مہمان بہت ساری چھوٹی موٹی چیزیں اپنے ساتھ بطور بھی لے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی دانست میں اب یہ چیزیں بے چارے میزبان کے استعمال کے قابل نہیں رہتیں۔ اسے ہماری بدنصیبی ہی کہیے کہ مرزا صاحب کا شمار ایسے ہی عجوبۂ روزگار مہمانوں میں ہوتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ہمارے تمام مالکانہ حقوق زبردستی اپنے نام کرا لیتے ہیں۔ ویسے وہ جب بھی ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں رخصتِ اتفاقی ہی لے کر آتے ہیں لیکن کچھ اتنے دنوں تک ٹک جاتے ہیں کہ ان کی رخصتِ اتفاقی خود بخود رخصتِ بیماری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے مزے اُڑانے کیلئے اور ہمارے کڑھنے اور جلنے کے لئے۔

اگر مہمان بننے کی دھن ہمارے سر میں نہ سماتی تو ہم تصور میں بھی مرزا صاحب کا نام نہ لیتے۔ لیکن اب مجبوری تھی۔ چنانچہ ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم نے ایک سیدھے سادے خط کے ذریعہ اُنھیں اپنی آمد کی اطلاع کر دی۔ اور پھر خوشی خوشی نکلنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ لیکن چوتھے ہی روز موصوف کا ایکسپریس لفافہ ملا۔ لکھا تھا:

برخوردار! تمہارا خط ملا اور تمہارے آنے کی اطلاع پا کر بڑی خوشی ہوئی گھر تمہارا ہے، ہم تمہارے ہیں اور یہ اسی اپنائیت کا تقاضہ ہے جو تمہیں صورتِ حال

سے اچھی طرح آگاہ کر رہا ہوں۔ اسے ہماری بدنصیبی ہی کہیے کہ ہماری ساس صاحبہ پروں ہی فالج کا شکار ہو گئیں، لقوے کی شکایت تو انھیں برسوں سے تھی ہی، بہتیرا علاج کر دیا لیکن بقول شاعر ـــ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور ابھی یہ پریشانی چل ہی رہی تھی کہ تمہاری چاچی کو بلڈ پریشر نے آدبوچا۔ اور وہ جو کہتے ہیں نا۔ "مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی"۔ چنانچہ مجھے بھی گٹھیا نے کھٹیا سے لگا دیا ہے۔ یہ سمجھ لو برخوردار گھر ہسپتال بن چکا ہے اور کوئی بھی صحیح الدماغ آدمی بغرض تفریح کبھی ہسپتال نہیں جاتا۔ پھر بھی گھر تمہارا ہے۔ شاید غلط لکھ گیا۔ گھر نہیں ہسپتال کہو۔ بہرحال تمہارا ہے۔ خیر یہ تو تھیں گھریلو پریشانیاں اب آؤ اس پریشانی کی طرف جس سے آج کل ساری بستی دوچار ہے۔ اور وہ ہے پانی کی قلت۔ میں تو سمجھتا ہوں دو ایک روز میں قحط کی صورت حال کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا جائے گا۔ چلو بھر پانی کے لیے لوگ ایک دوسرے کا خون بہانے تیار ہیں۔ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں ہر شخص انگریزوں کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ردی کے بیوپاریوں کی بن آئی ہے۔ پرانے اخبار تک اصلی قیمت سے دگنی چوگنی قیمت پر بک رہے ہیں۔ اور برخوردار جب سے مجبوراً کاغذ کا استعمال شروع کیا ہے۔ تب سے اپنے اس خیال پر کوفت ہو رہی ہے کہ ہم اب تک انگریزوں کو خواہ مخواہ اس قدر نفاست پسند سمجھتے رہے ہیں۔ بہرحال خدا تمہیں ان پریشانیوں سے محفوظ رکھے۔ تمہارا خیر اندیش

مرزا ظریف

نوٹ:۔ لوابسی پہ اپنے ارادہ سے آگاہ کرو۔ اور اگر آنے پر کمر کس ہی لی ہے تو تمہاری چاچی کا اصرار ہے کہ آتے ہوئے تیس کلو باریک بریانی کے چاول لیتے آنا یہاں آج کل چاول بھی عنقا ہیں۔۔ !!

مرزا صاحب کے ہاں سے اس قدر کورا جواب پا کر ہم نے لائق میاں کے ہاں

تقدیر آزمانی چاہی۔ ویسے لائق میاں ہمارے کوئی خاص دوست نہیں ہیں کبھی زمانے میں وہ ہمارے بھائی صاحب کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ آدمی چونکہ بے حد چرب زبان اور موقع شناس ہیں اسی لیے اپنی غرض کے وقت پڑوسی کو چچا ہی نہیں بلکہ بعض اوقات باپ بھی ماننے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ بمبئی میں مستقل قیام ہے اور کسی کمپنی میں سیلزمین ہیں۔ اس لئے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ جب بھی ہمارے شہر میں وارد ہوتے ہیں بقول خود ان کے ہماری خیر خیریت دریافت کرنے کی غرض سے ہمارے ہاں کم از کم آٹھ دس دن قیام ضرور فرماتے ہیں اور پتہ نہیں کیوں انھیں ہمارے تولئے بہت پسند آتے ہیں جب بھی تشریف لاتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ میاں تمہارے شہر کے تولئے بڑے غضب کے ہوتے ہیں۔ نت نئے ڈیزائن، خوب صورت رنگ اور پھر اس قدر دبیز، اس قدر ملائم۔ کچھ یوں تعریفوں کے پل باندھ کر وہی پرانا تولیہ جو پچھلی کسی چکر میں ہمارے ہاں سے اُٹھایا ہوا ہوتا ہے چھوڑ کر نہایت ہی نالائقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیا تولیہ اُٹھا لے جاتے ہیں۔ ان کی نالائقیوں کو یاد کرکے جی تو نہیں چاہتا تھا کہ لائق صاحب جیسے نالائق آدمی کے مہمان بنیں۔ لیکن مہمان بننے کی اس ضد کا بھلا ہو ان کی تمام پچھلی نالائقیوں کو بھلانا ہی پڑا۔ ہم نے بذریعہ تار انھیں اپنے اِس ارادے سے آگاہ کردیا لیکن دوسرے دن دفتر پہنچے ہی تھے کہ لائق صاحب نے بذریعہ ٹرنک کال اپنی فطری نالائقی کا مظاہرہ شروع کردیا۔ آپ کا تار ملا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کرکے۔ بخدا مجھے بڑی مسرت ہوتی لیکن کیا عرض کروں پچھلے سال آنکھوں کی جو عجیب وغریب متعدی وبا یہاں پھیلی تھی اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور عرض بھی ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا میں خود اپنے سسر صاحب کے سسرال میں ٹھہرا ہوا ہوں، یعنی بد قسمتی سے میں ایک گھر داماد کہ داماد ہوں۔ غالباً آپ میری مجبوری سمجھ گئے ہوں گے۔۔۔۔"

ہم نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر مجبوراً جلیس صاحب کو تکلیف دینے کی ٹھانی ۔ موصوف گرما کی چھٹیاں کم و بیش ہر سال ہمارے ہاں ہی بتاتے ہیں بمعہ اہل و عیال ۔ پچھلے برس تو غضب ہی کر دیا تھا انھوں نے نہ صرف اہل و عیال بلکہ بمعہ سسرال پہنچ گئے تھے ۔ ہم دفتر جانے کی غرض سے باہر نکلے ہی تھے کہ جیسے زلزلہ آ گیا جلیس صاحب جو بذاتِ خود کسی جلوس سے کم نہیں اپنی دو عدد ابابیلی مونچھوں سمیت ٹھوک کے حساب سے بیوی بچوں ، ساس سالیوں ، سالوں اور ملازموں کی فوج میں گھرے متعدد ٹرنکوں ، بستروں ، تھیلوں وغیرہ وغیرہ سے لدے پھندے سامنے کھڑے تھے ہم نے اس اچھی خاصی بٹالین کو دیکھ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا ۔ اور دل ہی دل میں سوچا عالم گیری فوج نے بھی شاید اس بے دردی سے گولکنڈہ قلعہ کا محاصرہ نہ کیا ہو گا اور پھر ابوالحسن تاناشاہ کی طرح ہم نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ۔ اور ایک مردہ سی مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے عرض کیا ۔ نہ کوئی اطلاع نہ کوئی خبر کم از کم تار دیدیتے تو روشن میاں کا ٹرک لے کر پہنچ جاتا ۔ غالباً آپ تبادلہ ہو کر یہاں آئے ہیں —"
ہماری بات پر دونوں ابابیلیں پھڑ پھڑائیں ۔ پھر ہم پر مسکراہٹ کی بجلی گراتے ہوئے بولے — میاں ! اگر اطلاع دے کر آتے تو یہ خوشی جو ہمیں اچانک دیکھ کر آپ محسوس کر رہے ہیں کہاں نصیب ہوتی ۔ ؟

عرض کیا " بجا فرمایا آپ نے ۔ کیا کہنے اس خوشی کے ۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہیں مارے خوشی کے شادی مرگ نہ ہو جاؤں ۔

جواب میں موصوف نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا ۔ اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے موصوف کی سرکردگی میں اس فوج ظفر موج نے گھر کے چپہ چپہ پر قبضہ جما لیا اور ہماری حیثیت ایک تباہ حال لٹے لٹائے مسافر کی سی ہو گئی ۔ اور اتنے پر بس نہیں ہوا ۔ موصوف کی ساس صاحبہ نے تو انتہا کر دی ۔ بے کھٹکے ہم پر بھی حکم چلانے لگیں ۔

کئی بار جی چاہا کہ دو ٹوک کہہ دیں۔ محترمہ ہم آپ کے داماد کے دوست ہیں داماد نہیں لیکن ہر بار یہی سوچ کر چپ ہو جاتے کہ ہندوستانی مرد ساس کے سلسلہ میں بے حد جذباتی ہوتا ہے۔ وہ بیوی کو چاہے رانی سمجھے یا باندی لیکن ساس کو ہر حال میں ملکۂ وکٹوریہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی جلیس صاحب کی ساس کو ملکۂ وکٹوریہ تسلیم کر لیا اور انکا ہر حکم بجالانے لگے۔

اسے بھی ہماری بد قسمتی کہئے کہ اولاد کے سلسلہ میں بھی موصوف بے انتہا خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ اگر انھیں شہر کے کسی فیملی پلاننگ سنٹر پر اپنے بال بچوں سمیت گلے میں یہ تحریر لٹکوا کر کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو بٹھا دیا جائے تو فیملی پلاننگ کے پرچار میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ جو سائز اور رنگ کہیں اور نہ نظر آتا ہو وہ اِن کے ہاں دیکھ لیجئے۔

ایک روز ہم دفتر سے تھکے ہارے گھر لوٹ کر دیکھتے کیا ہیں کہ موصوف کے برخوردار نمبر آٹھ بڑے ہی انہماک سے کسی چیز کے بخیئے اُدھیڑنے میں مصروف ہیں ان کے چاروں طرف ڈھیر ساری مڑی تڑی کاڑیاں اور کالے کپڑے کی دھجیاں بکھری پڑی ہیں۔ پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اجزائے پریشاں آخر کس شئے کے ہیں لیکن جب ذہن میں انہیں ترتیب دیا تو جی چاہا کہ سر پیٹ لیں۔ وہ ہماری چھتری کے اجزائے پریشاں تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے ہم نے اپنی شہید چھتری کے اجزائے پریشان اکٹھے کئے۔ اسی پل بیگم جلیس کمرے میں داخل ہوئیں اور لٹھ مار سلام جھاڑنے کے بعد اپنے ہونہار سے بولیں دیکھو چھوٹو چاچا آگئے۔ ان کی چھتری واپس کر دو۔

بھابی یہ چھتری مجھے مل گئی۔ ہم نے چھتری کے اجزائے پریشان اُنھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

ارے چھوٹو! یہ کیا کر دیا تم نے ۔۔ ! بیگم جلیس نے بڑے کمالِ ضبط سے ہنسی

رو کئے ہوئے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔ پھر مزید بولیں۔ کیا بتاؤں بھائی صاحب، چھوٹو کی اِن حرکتوں سے میں تو تنگ آچکی ہوں۔ کوئی چیز صحیح سلامت نہیں رہنے دیتا اور اس کے ابا ہیں کہ اس کی اِن حرکتوں پر فخر سے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہو کر بہت بڑا انجینیر بنے گا۔" اسی پل جلیس صاحب داخل ہوئے اور بات اُچک کر بولے "دریں چہ شک" کیا میں غلط کہتا ہوں سلیم صاحب۔"

جی نہیں۔" ہم نے بہ ہزار دقت مسکرا کر کہا۔ آپ بالکل دُرست کہتے ہیں آپ کے برخوردار تو پیدائشی انجینیر ہیں۔ ثبوت کے طور پر یہ چھتری ملاحظہ فرمائیے۔ چھتری کے اُدھڑے ہوئے بخیے دیکھ کر موصوف پر ہنسی اور کھانسی کا ملا جلا دورہ پڑ گیا۔ بدقت تمام اِس سے نجات پا کر جلتی پر تیل چھڑکنے والے انداز میں بولے۔ "غالباً چھتری بہت پرانی تھی"۔

عرض کیا۔ جی ہاں کافی پرانی، ابھی چھ مہینے پہلے خریدی تھی ...!!

دو چار روز بعد ایک اور ذہنی جھٹکے سے دوچار ہوئے۔ دفتر سے لوٹ کر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے صوفے پر لیٹنے ہی والے تھے کہ بیگم جلیس فل ٹون (Full Tone) میں چلائیں "بھائی صاحب صوفہ پرمت لیٹیے پھٹا ہوا ہے۔" اس اطلاع پر ہم لرز اُٹھے ابھی مہینہ بھر پہلے ہی تو بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔ آخر پھٹ کیسے گیا۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔ اور وہ ہنس کر بولیں۔ "آپ آج شاید جلدی میں بلیڈ کھلی چھوڑ گئے تھے اور وہ موٹو کے ہاتھ لگ گئی"۔

اور آگے جو کچھ ستم ہمارے واحد صوفے پر ہوا ہو گا اس کا تصور ہی کر کے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بیگم صاحبہ بدستور بڑے فخریہ انداز میں کہے جا رہی تھیں "چیر پھاڑ کا بہت شوق ہے موٹو کو۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بڑا ہو کر ضرور ڈاکٹر بنے گا۔"

کیوں نہیں۔ پوت کے پاؤں تو پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔ دیکھیے تو کس جگہ تک

سے بلیڈ چلائی ہے۔ اب کوئی ماہر کاریگر بھی اس صوفہ کی مرمت نہیں کر سکتا۔ ہمیں مجبوراً
اُن کی ہاں میں ہاں ملانی پڑی۔

خدا خدا کر کے چھٹیاں ختم ہوئیں۔ اور وہ لوگ پورے ایک مہینہ تک ہم پر ہمارے گھر پرستان سے حکومت کرنے کے بعد گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ساری بنیادیں ہلا کر کسی فاتح کی طرح سدھارے اور ان کے جانے کے بعد ہم نے اپنے گھر کی خستہ حالی کو دیکھ کر سوچا۔ غالباً نادر شاہ نے بھی دلی کو اس بے دردی سے نہیں اُجاڑا ہوگا گھر کی ہر شئے سے یتیمی برس رہی تھی۔ ہر میز، ہر کرسی لنگڑی ہو چکی تھی۔ ریڈیو جو دُنیا بھر کے اسٹیشن پکڑ لیتا تھا ٹیوننگ (Tuning) کی ڈوری ٹوٹ جانے کی وجہ سے اب ایک ایسے اسٹیشن پر اٹکا ہوا تھا جہاں کی زبان سے ہم قطعی ناواقف تھے۔ ڈرائنگ روم اصطبل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بیڈ روم باورچی خانے میں۔ اور باورچی خانہ بیت الخلاء میں الغرض سارے گھر کا نقشہ بگڑ چکا تھا۔ اور گھر کو واپس گھر کی شکل میں لانے کے لئے ہمیں جو پاپڑ بیلنے پڑے وہ تو کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔!

خیر مرزا صاحب اور لائق میاں کی طرف سے ہم مایوس ہو چکے تھے اب آخری سہارا جلیس صاحب کا تھا ابھی گرما کی چھٹیاں شروع ہونے میں کافی دن تھے اس لئے ہم نے سوچا اس سے پہلے کہ جلیس صاحب آدھمکیں کیوں نہ ہم خود اچانک ان کے ہاں پہنچ جائیں چنانچہ فوراً ہی رخت سفر باندھا اور ٹیکسی کی تلاش میں باہر نکلے ہی تھے کہ پھر زلزلہ آگیا زمین گردش کرنے لگی، آسمان گرتا ہوا محسوس ہوا۔ جلیس صاحب بمعہ جلوس کے یہاں موجود تھے۔ ہم نے بدقت تمام ان سے پوچھا اس بار جلدی کیسے آنا ہوا۔ آپ تو ہمیشہ بچوں کے امتحانات کے بعد ہی تشریف لاتے ہیں۔

مسکرا کر بولے۔" میاں یہ سب تلنگانہ تحریک کی کارستانی ہے۔ بچوں کے امتحانات ایک غیر معینہ مدت تک کے لئے ملتوی کر دیئے گئے ہیں۔

پھر ہمارے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر پوچھا، کیا آپ کہیں جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ مہینہ بھر کے لئے ٹور پر جا رہا ہوں۔" ہم نے فوراً بہانہ بنایا۔

"گھر مقفل کر کے؟ میاں دیکھتے نہیں ہو زمانہ کس قدر برا ہے۔ آج کل کے چور اچکے مکینوں کی موجودگی میں گھروں پر ہاتھ صاف کر دیتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم بڑے موقع پر پہنچ گئے۔ لائیے چابی مجھے دیجئے۔"

ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ہمیں چابی دینا ہی پڑی۔ چابی لینے کے بعد بولے۔ "اب آپ اطمینان سے جائیے۔ ہمارے ہوتے ہوئے یہاں چور کیا چور کا چاچا بھی نہیں پھٹک سکتا۔"

درست فرمایا۔ جہاں آپ ہوں وہاں چوروں کی کیا ضرورت۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا۔ اور پھر ایک سستے سے ہوٹل کا رخ کیا۔ اب ہمیں اپنے گھر کے ہوتے ہوئے اس وقت تک کسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا جب تک کہ جلیس صاحب واپس نہیں لوٹ جاتے۔۔!!



شہرت کا چکر

کچھ عقل مند شہرت کو ایک ایسی چڑیا سے تعبیر کرتے ہیں جسے تدبیر کے جھانسے سے پھانسا جا سکتا ہے۔ گویا اس کے لئے چڑی مار بننا ضروری ہے اور بعض دانشور کہتے ہیں کہ شہرت ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں، ہم ان دانشوروں سے ایک حد تک متفق بھی ہیں لیکن جس طرح ترقی کرنے کے کئی راستے ہیں اسی طرح شہرت کے بھی کئی میدان اور اکھاڑے ہیں۔ جس طرح اکھاڑے میں اترنے سے پہلے ایک پہلوان کو اپنی قوت کا صحیح اندازہ لگالینا ضروری ہوتا ہے اسی طرح شہرت کے کسی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگالینا ضروری ہے، مثلاً لیڈری کے ذریعہ شہرت حاصل کرنا ہو تو ایک آدمی کو چرب زبان، موقع شناس، چلتا پرزہ، ڈھیٹ اور چکنا گھڑا بننا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کھیل کود کے میدان میں نام کمانا ہو تو بات بات پر ریفری پر پلٹ پڑنے اور مخالف کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں توڑنے کی صلاحیت کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔ اگر شاعری کے میدان میں شہرت کے جھنڈے گاڑنا ہو تو، ترکہ میں دادا جان مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام تخلص کی ہیرا پھیری کے ساتھ حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس عالم آب و گل میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جس کے سینہ میں شہرت حاصل کرنے کی خواہش نہ پلتی ہو۔ بلکہ کسی کا سینہ اگر اس خواہش سے خالی ہو تو بلاشبہ اسکی

صحیح الدماغی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ہم چونکہ ماضی میں بھی صحیح الدماغ تھے اور اب بھی ہیں اس لئے شہرت کی دیوی کو رام کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح جانچا، پرکھا، بہ الفاظ دیگر خود کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ لیڈری اور کھیل کود اپنے بس کا روگ نہیں۔

جہاں تک لیڈری کا تعلق ہے اس سلسلے میں نہ صرف ہم بلکہ سارا محلہ بہ فضل تعالےٰ ان جرثوموں سے محفوظ ہے۔ جو ایک اچھے بھلے انسان کو لیڈری جیسی مہلک بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں جس کا صرف ایک ہی علاج ہے، قوم کے غم میں ڈنڈ کھانا۔

ویسے ہمارے محلّے میں اکثر سیاسی، نیم سیاسی، ادبی، غیر ادبی قسم کے جلسوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے محلّے کے کسی فرد کو اسٹیج پر اُچھلتا کودتا ہوا کبھی نہیں دیکھا اب رہا کھیل کود کا میدان، تو ہماری جسمانی حالت اور ساخت کو دیکھتے ہوئے ہمارے کھلاڑی ساتھیوں نے ہمیں کبھی اس قابل نہیں سمجھا۔ ویسے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بچپن میں کئی بار اپنی ہی گلی میں "گلی ڈنڈا" کھیلنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن ہر بار ہمارے دوست یہ کہہ کر ہمارے حوصلے پست کر دیتے کہ گلی کے ہاتھ میں ڈنڈا۔!

کالج کے زمانے میں اپنی ہم جماعت لڑکیوں پر اپنی مردانگی کا سکہ جمانے کے لئے ہم نے دو ایک بار دوڑ کے مقابلوں میں شرکت ضرور کی تھی اور اسقدر ہزیمت اُٹھائی کہ وہ سماں یاد کرکے آج بھی شرم سے پانی پانی ہوتے ہی بھاپ بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ اور اس طرح باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا۔ بلکہ اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کا وہ طنزیہ جملہ ہمیں آج تک یاد ہے "غالباً آپ غلطی سے دوڑ کے مقابلے میں شریک ہو گئے۔ حالانکہ آپکو اصولاً چلنے کے مقابلے میں شریک ہونا تھا۔"

خیر کھیل کود، اور لیڈری ان دونوں میدانوں میں چونکہ ہماری دال گلنی مشکل تھی اس لیئے ہم نے اپنے "ازلی شوق" کی باگ شاعری اور ادب کے میدان کی طرف موڑ دی۔

یہ میدان ہمارے لئے نسبتاً آسان تھا۔ ہمیں لکھنے لکھانے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اسکول کے زمانے میں کورس کی کتابوں سے نظمیں وغیرہ بڑی صفائی سے نقل کرکے اس شان سے گھر کے نوکروں چاکروں کو سناتے جیسے وہ ہماری ذہنی اپج کا نتیجہ ہوں۔ لیکن بچپن کے ہنڈولے سے جیسے ہی جوانی کے آنگن میں قدم رکھا چھپنے کی خواہش نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ہی شفٹ میں متعدد انگڑائیاں لے کر اپنے عین شباب کا اعلان کردیا۔ جس طرح ایک مفلس اور کنگال کثیر العیال کلرک اپنی بیٹی کے اچانک جوان ہونے کی خبر سن کر بوکھلا جاتا ہے ہم بھی کچھ اسی طرح بوکھلا گئے۔ بے سوچے سمجھے برسوں پہلے جو قلم اٹھالیا تھا اب اسے بٹھانا دشوار معلوم ہورہا تھا۔ اب نقل سے نہیں بلکہ عقل سے کام لینا تھا، چنانچہ جب عقل سے کام لیا تو پتہ چلا کہ لکھنا لکھانا تو لوہے کے چنے چبانا ہے۔ چنانچہ لوہے کے چنے کی تلاش شروع کردی لیکن چنے تو نہیں ملے چھرے مل گئے جنھیں چنوں کا نعم البدل سمجھ کر چبائے ہی تھے کہ کچھ دندانِ شریف شہید ہوگئے اور پھر اس سے پہلے کہ ہم مکمل جبڑے شریف سے ہاتھ بلکہ منہ دھو کر پھر سے شیر خوار کہلاتے، ایک دوست کے والد بزرگوار نے جو اپنے مرحوم والد صاحب کا غیر مطبوعہ بلکہ مطبوعہ کلام بھی اپنے نام سے شائع کرواتے ہیں، فرمایا کہ لوہے کے چنے چبانا تو صرف ایک محاورہ ہے اور اردو ادب ایسے ہی دنداں شکن محاوروں کی وجہ سے دنیا کے ہر ادب کے دانت کھٹے کرسکتا ہے۔ پھر انہوں نے ہمیں دنیا بھر کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ بعض اوقات مطالعہ اس قدر سودمند ثابت ہوتا ہے کہ خود کچھ لکھنے لکھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مطالعہ کے دوران ایسے ایسے بیش بہا مضامین ہاتھ لگتے ہیں جو بلا کھٹکے عنوان بدل کر اپنے نام کے ساتھ شائع کردئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ انہی کے زرّین مشورے پر عمل کرکے ہم نے ادبی، جاسوسی، جنسی، تاریخی، جغرافیائی، سائنسی ہر قسم کے لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا اور معروف، غیر معروف گمنام، بدنام، ہر قسم اور ہر گریڈ کے شاعروں کے دیوان دیوانہ وار پڑھ ڈالے، اور پھر

خود کو ہر فن مولا تصور کر کے ادب کی ہر صنف سے چھیڑ خانیاں شروع کر دیں۔ نتیجتہً ایک قلیل مدت میں اتنے کاغذ کالے کر ڈالے کہ خود پر ردی کے کسی تھوک بیوپاری کا گمان ہونے لگا۔ اگر اسی وقت ہم ردی کا بیوپار شروع کر دیتے تو آج کم از کم ایک عدد دوکان اور دو عدد مکان کے بلا شرکت غیرے مالک ہوتے۔

خیر، اُسی ردی کے ڈھیر میں سے چن کر ایک غزل نما چیز ایک مقامی جریدے کو بذریعہ رجسٹری (جوابی لفافہ سمیت) بھیج دی جو تھا تو ماہنامہ لیکن سال میں دو چار بار ہی آسمانِ ادب پر طلوع ہوتا تھا۔ کہتے ہیں نئے فقیر کو بھیک کی جلدی ہوتی ہے، ہم بھی آہٹ پہ کان در پہ نظر اور دل میں اشتیاق کے دیئے جلائے جواب کے منتظر بیٹھے تھے لیکن جواب تھا کہ لاجواب ثابت ہو رہا تھا، اور جب آنکھیں سچ مچ پتھرا گئیں، کان سن ہو گئے اور دل نہ صرف بیٹھ گیا بلکہ اچھا خاصا لیٹ گیا تب کہیں جواب موصول ہوا۔ وہ بھی ایڈیٹر صاحب کے آداب و معذرت کے ساتھ۔ غزل بے رنگ بلکہ بد رنگ لوٹا دی گئی۔ مدیر موصوف نے لکھا تھا۔

محترم! آپ نے غزل کا ڈھانچہ تو کسی نہ کسی طرح تیار کر ڈالا جو کسی میڈیکل کالج کے تجربہ گاہ والے ڈھانچے سے بے حد ملتا جلتا ہے لیکن لاکھ ڈھونڈنے پر بھی اسکی کمر کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ کسی لکھنوی شاعر کا یہ شعر آپ کی غزل پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

نہ جانے وہ ناڑا کہاں باندھتے ہیں

سنا ہے کہ ان کی کمر ہی نہیں ہے

خط پڑھنے کے بعد ہماری جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے وہ تو غنیمت کے گھر کو دیکھ کر دشت یاد آگیا ورنہ دشت پیمائی کے لئے نکل گئے ہوتے۔ ایک کرم فرمانے مشورہ دیا کہ آج کے بیشتر خود ساختہ مدیرانِ کرام مضمون وغیرہ پڑھتے نہیں۔ بس لکھنے والے کے نام کے ساتھ ڈگریوں کا دُم چھلہ تلاش کرتے ہیں۔ لہذا میری مانیئے تو اپنے نام کے ساتھ کے۔ جی سے لے کر ایم۔ اے تک کی ڈگریاں جلی حرفوں میں لکھا کیجئے۔ مشورہ حالانکہ نامعقول

تھا لیکن ہم چونکہ جینے کی خواہشِ ناتمام کے ہاتھوں کھلونا بن چکے تھے اور معقول و نامعقول کی تمام حدیں پھلانگ چکے تھے اس لئے نہ صرف ڈگریوں کا دم چھلہ بلکہ ان کی "مُردکاپیاں" بھی ایک گزیٹیڈ آفیسر کے دستخط و مہر سمیت اپنے مضامین کے ساتھ منسلک کرکے بھیجنے لگے لیکن پھر بھی کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔ گویا ادبی میدان میں ہم گدھے سے بھی گئے گزرے تھے۔ اس سے پہلے کہ یہ احساس ہمیں زندہ درگور کر دیتا ایک اور کرم فرما کو ہمارے حالِ زار پر رحم آگیا۔ (نہ جانے کیوں صرف ایسے حضرات کو ہم پر رحم نہیں آتا جو مدیرانِ کرام کے زمرے میں آتے ہیں)

ہمارے ان کرم فرما نے ہمیں اِدھر اُدھر دوڑا کر خوب تھکا دینے کے بعد ایک روز یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ اُن کے ایک قریبی شناسا جو دراصل اُن کے سُسر کے سمدھی کے پڑوسی ہیں اور خواتین کے مقبولِ عام ماہنامے "چراغِ خانہ" کے نہ صرف پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر ہیں بلکہ کاتب، نقل نویس، چپراسی وغیرہ بھی خود ہی ہیں، ان سے ہمارا باضابطہ و باقاعدہ تعارف کروا دیں گے۔ یہ مژدہ جانفزا تو ہمارے حق میں مژدۂ جان لیوا ثابت ہوتے ہوتے رہ گیا۔ چونکہ مارے خوشی کے ہمارے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ طاری ہو گیا تھا۔ اس لئے ہم ایک عدد ڈبل بس، دو عدد آٹو اور تین عدد رکشا و بس کی زد میں آنے سے بال بال بچ گئے۔ اور حواس چونکہ پوری طرح بجا نہیں ہو سکے تھے اس لئے اپنی سسرال کے دھوکے میں بھائی کے سسرال پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے اپنے گھر کے بجائے پڑوسی کے گھر میں گھس گئے۔ جب پردہ دار خواتین نے ہڑبڑایا اور ہمارے پڑوسی بڑے خاں پہلوان نے ہمارا ٹینٹوا دبایا تب کہیں ہوش ٹھکانے آئے۔ غالباً ایسی ہی خوشی کو شادیٔ مرگ کہتے ہیں۔"

خدا خدا کرکے وہ بھی دن آگیا جب ہم نہا دھو کر ایک مدت کے بعد دربارِ الٰہی میں سربسجود ہو کر بڑی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ اپنے کرم فرما کے ہمراہ "چراغِ خانہ" کے دفتر

پہنچے۔ جیسے ہی اندر داخل ہوئے، لرز اٹھے۔ کمرہ اس قدر تنگ و تاریک تھا کہ ہماری نگاہوں کے آگے کسی نہایت ہی پرانی اور بوسیدہ قبر کا نقشہ گھوم گیا۔ دل نے فی الفور کہا۔ مقام عبرت ہے غافل، اپنے گناہوں سے توبہ کرلے۔ عذابِ قبر بھی اس کے آگے کوئی چیز نہیں۔ اور پھر جیسے ہی بوسیدہ فائلوں کے انبار کے پیچھے سے جھانکنے والے چہرے پر نظر پڑی ہماری گھگھی بندھ گئی۔ آنکھوں کی جگہ صرف دو سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ اسی عالم ہیبت میں ہمارے کرم فرما نے اس قبر نما دفتر کے زندہ بدستِ مردہ مدیر سے ہماری آمد کا مقصد بیان کیا۔ جس کے فوراً بعد موصوف نے حسبِ توقع ہی سوال کیا۔ آپ اب تک کہیں چھپے بھی ہیں ..."

جواب میں ہمارا گڑبڑانا لازمی تھا۔ ہمارے کرم فرما نے ہماری متغیر حالت دیکھ کر دار سنبھال لیا اور بولے "قبلہ دراصل یہ ایک ناتراشیدہ ہیرا ہیں، بس ایک بار ان کی انگلی تھام لیجئے پھر یہ آپ کی کلائی خود بخود پکڑلیں گے۔"

"بہت خوب" وہ ہنسے، اور ان کا جوکڑایوں تھرتھرایا جوں کوئی بوسیدہ عمارت زلزلے کے جھٹکے سے تھرتھراتی ہے۔ پھر بولے "ان کی تخلیقات دیکھے بغیر نہ میں ان کی انگلی پکڑوں گا اور نہ ہی یہ میری کلائی تھام سکیں گے۔"

جواب میں ہم نے اپنی بغل میں دبی فائل ان کی خدمت میں پیش کردی جسے وہ کچھ دیر تک تو یوں تولتے رہے جیسے وہ ردّی کے بیوپاری رہے ہوں پھر ہفتہ بھر بعد ملنے کو کہہ کر، ہمیں باہر کا راستہ دکھلائے بغیر خود فائلوں کے انبار کے پیچھے غائب ہوگئے۔

ہفتہ بھر تک ہم لیٹے لیٹے، بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے، الغرض سوتے جاگتے طرح طرح کے خواب دیکھتے رہے۔ کبھی ہمیں اپنا نام آسمانِ ادب پر دُمدار ستارے کی طرح چمکتا نظر آتا تو کبھی جھاڑ و تارے کی طرح لٹکتا۔ کبھی اپنے دروازے پر ان تمام مدیرانِ کرام کا جمِ غفیر نظر آتا جو ہمارے مضامین بے رنگ لوٹا چکے ہیں۔ خواب میں وہ سب لوٹائے ہوئے

مضامین حاصل کرنے کیلئے بڑی اسٹائیل کشتیوں میں معروف نظر آتے ؛

ایک خواب تو بڑا ہی دھواں دھار دیکھ ڈالا ۔ آسمانِ ادب کے وہ درخشندہ ستارے جو بقید حیات ہیں اور وہ جو ڈوب چکے ہیں، سب کے سب اپنی اپنی آٹوگراف بک سنبھالے ہم سے آٹوگراف لیتے ہوئے نظر آئے ۔ لیکن ہمارے یہ خواب اُس وقت چور چور ہوگئے جب ہفتہ بھر بعد ملاقات کے دوران مدیر "چراغِ خانہ" نے یہ کہہ کر ہمارے "دماغِ خانہ" کی روشنی گل کردی کہ ہماری نگارشات کسی بھی زاویہ سے نہ تو ادبی کہلائی جاسکتی ہیں نہ نیم ادبی ، اور نہ ہی فحش ۔ ہماری تخلیقات کم از کم فحش ہی ہوتیں تو وہ ضرور اپنے جریدے میں شائع کرتے کیونکہ خواتین کے پرچوں میں فحش ادب زور پکڑتا جارہا ہے ۔ ہماری تخلیقات چونکہ موصوف کی نظر میں بوجھل قسم کی تھیں اس لئے ایسی چیزیں شائع کرکے وہ خواتین کے تھکے ہوئے ذہنوں پر اور بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے ۔ انہیں دراصل یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ ہماری تحریروں کی شمولیت ان کے ماہنامہ "چراغِ خانہ" کو کہیں "شمعِ محفل" نہ بنادے ؛

اِدھر ہمارے احساسات پر اوس بلکہ اولے پڑگئے اور ہمیں یقین ہوگیا کہ ہمارا یہ ادبی اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکتا ۔ چنانچہ اپنی تحریروں کا پلندہ وہیں پٹک کر یہ عہد کرکے وہاں سے لوٹ آئے کہ اب نہ تو کبھی انہیں اپنی شکل دکھائیں گے اور نہ ہی ان کی شکل دیکھیں گے ..

لیکن چند روز بعد ہمارے وہی کرم فرما دوڑے دوڑے آئے اور ہمیں گھسیٹ کر پھر موصوف کے تیرہ تار دفتر میں پہنچا دیا ۔ ہم اس اچانک اور غیر متوقع طلبی پر حیران تھے ۔ موصوف نے ہمیں دیکھتے ہی نعرہ لگایا ۔ "برخوردار ! تم تو چھپے رستم نکلے ۔ ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ تمہارا ڈھائی روپے والا معمولی قلم ایسے معلوماتی مضامین بھی صفحۂ قرطاس پر بکھیر سکتا ہے ، واللہ کیا بیش بہا قسم کے مضامین ہیں ۔ شوہروں کو قابو میں رکھنے کے گرم گھریلو آزمودہ ٹوٹکے .."

ہم برداشت کی تمام حدیں پھلانگ چکے تھے۔ جھپٹ کر کاغذوں کا پلندہ، موصوف سے چھین لیا۔ دیکھا تحریر واقعی ہماری تھی لیکن وہ سارے گر ہمارے ٹوٹکے جو ہم نے طلسم ہفت رنگ قسم کے نسخوں سے نقل کئے تھے جو ردی میں ہمارے ہاتھ آئے تھے۔ اور کچھ ہم بزرگوں کے گنڈے تعویذ شاہ صاحب کی تھوڑی بہت صحبت بافیض کی دین تھے۔ بہر حال ہمارا یہ جوہر قسم کا مضمون اگلے ہی شمارے میں چھپ گیا لیکن واہ ری بدنصیبی، مضمون ہمارا اور نام "سامری" کا۔ ہمارے نام کی جگہ "سامری کے قلم سے" لکھا تھا۔ ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس سے پہلے کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے ہم موصوف کی بھتیجی سائیکل کا کچومر نکال دیتے ان کی بوسیدہ چھتری کی مزید دھجیاں اڑاتے، موصوف نے انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ کر ہمارا سارا غصہ ٹھنڈا کر دیا کہ انہوں نے ہمیں اپنی مجلس ادارت میں شامل کر لیا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ اب ہم ہر ماہ سامری کے قلمی نام سے مستقلاً ان کے جریدے کے لئے لکھا کریں گے۔۔"

بس حضور وہ دن اور آج کا دن ہے، ہمارے غیر شادی شدہ قلم سے صرف شادی شدہ خواتین کیلئے نت نئے گر اور انوکھے ٹوٹکے نکل رہے ہیں اور قلم ہمارا اور نام سامری کا چل رہا ہے۔۔



نفسیاتی نکتہ

"صاحبزادی کا مزاج تو کسی سے ملتا ہی نہیں، کوئی نظر میں جچتا ہی نہیں، یہ سب باوا کے بےجا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ میں تو شروع سے ہی سمجھاتی رہی ہوں کہ دیکھو لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے، اسے سدا ماں باپ کی چھاتی سے لگ کر بیٹھنا نہیں ہے، ایکدن دوسرے کے گھر جانا ہے، اسے سر نہ چڑھاؤ۔ مگر کوئی میری بات مانے تب نا"۔ بیگم صاحبہ اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان شاداب کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"آپ بجا فرماتی ہیں، چچی جان"۔ شاداب نے فوراً لقمہ دیا۔ "لڑکی تو سارے خاندان کی ناک ہوتی ہے۔ سارے میکے کی لاج اُسی کے ہاتھ ہوتی ہے۔ ایک سگھڑ سلیقہ مند لڑکی اپنے میکے کا نام روشن کرتی ہے اور ایک پھوہڑ مونہہ پھٹ بدتمیز لڑکی ۔۔۔ توبہ توبہ!

"اور نہیں تو کیا، شاداب میاں اب تم ہی کہو، لڑکا ڈاکٹر ہے، بارہ پندرہ سو کی پریکٹس ہے، شریف ہے، صاحبِ جائیداد ہے۔ اور پھر اکلوتا ہے اب اس سے اچھا پیام آسکتا ہے بھلا؟"۔

"جی نہیں، بالکل نہیں۔ میں تو کہتا ہوں چچی جان آنکھ میچ کر، بلکہ انصاف کی دیوی کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر شگفتہ کو اُس ڈاکٹر کے حوالے کر دیجئے"۔

"یہ میرا نام فاتحہ میں کیوں لیا گیا؟" شگفتہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی

"ہائے ہائے اس چھوکری کی زبان کو تو لگام نہیں۔ بے سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔" بیگم صاحب نے اپنا سر پیٹ لیا۔"

"صاف گوئی ہمارا مسلک ہے۔ آپ جو چاہیں سمجھیں بندہ نواز۔" کیوں شاداب شگفتہ نے برجستگی سے کہا۔

"بجا پیر و مرشد" شاداب سر جھکا کر بولا۔

"پہلے یہ بتا کمبخت، تو نے آخر اس رشتے سے انکار کیوں کیا؟" بیگم صاحبہ نے جھلا کر پوچھا۔"

"کیونکہ مجھے اس کا حق تھا"

"ارے کوئی اس چھوکری کی دیدہ دلیری تو دیکھے، کیا شرم و حیا تجھے چھو کر بھی نہیں گئی؟"

"اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے میں شرم کیسی ممی؟ شادی مجھے کرنی ہے، زندگی بھر کا روگ پالنے سے پہلے مجھے جانچنے اور پرکھنے کا بھی حق نہیں"

"کیوں نہیں، تمہیں پورا پورا اختیار ہے شگفتہ، مگر چچی جان کوئی تمہاری دشمن تو نہیں۔ انکی محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ شادی جسے تم زندگی بھر کا روگ سمجھتی ہو، اس روگ کے علاج کیلئے انہوں نے تمہارے لئے ایک ڈاکٹر کا انتخاب کیا"

"ہاں بیٹا، اب تم ہی سمجھاؤ اسے۔ میں تو ہار گئی" بیگم صاحبہ روہانسی ہو کر بولیں۔

"اب تو بس ہر بات میں یہی کہتی ہیں ممی کہ میں تو ہار گئی، مگر پھر بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں جن ڈاکٹر صاحب کی بے جا سفارش کو آپ نے اپنا فرض سمجھ رکھا ہے، اُن کی مانگ سنی ہے آپ نے؟ پورے پچیس ہزار کا سوال کیا ہے۔ وہ بھی نقد!"

"ہاں سنا ہے میں نے، میں کوئی بہری نہیں۔ اس میں مانگنے والوں کا کیا قصور کوئی ہماری حیثیت دیکھ کر ہی سوال کریگا۔ میں پوچھتی ہوں کیا ہم فقیر ہیں"

"بالکل نہیں چچی جان، بلکہ میں کہتا ہوں پچیس ہزار تو بہت کم ہیں۔ ان بیچاروں کو شاید آپکی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں، ورنہ پچاس ہزار سے کم کی مانگ ہرگز نہ کرتے۔ آخر چچا جان منصف ہیں منصف۔ کوئی معمولی نہیں"

"مانا کہ ہم اس قابل ہیں کہ ہم سے اتنی مانگ کیجائے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ مانگنے والوں کو بھی تو اپنی حیثیت دیکھ لینی چاہیئے"

شگفتہ کی اس بات پر بیگم صاحبہ جھلا کر بولیں "اے تو انکی حیثیت کو کیا ہوا! اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں"

"جی ہاں کھاتے پیتے تو ہیں ہی، اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت کیا ہوگا کہ ان ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گینڈا جھومتا چلا آرہا ہے"

"ہائے ہائے، میں تو بھر پائی اس منہ پھٹ لڑکی سے۔ یہ سب اس انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے"

"بالکل چچی جان، کالج کا ماحول اس پر بھانت بھانت کی لڑکیوں کی صحبت کا اثر، دیکھ لیجیے سر چڑھ کر بول رہا ہے"

"ہائے میں نے تو اسی وقت ٹوکا تھا۔ جب یہ کالج میں داخلہ لینے کیلئے ضد کر رہی تھی، مگر کوئی میری بات پر کان دھرے تب نا۔ باوا جان تو لاڈلی کو بی۔ اے، ایم۔ اے کرانے پر تلے ہوئے تھے۔ میں پوچھتی ہوں، کیا اسی دن کیلئے بی۔ اے کرایا تھا"

"کہ ایکدن اماں باوا پر ہی ریسرچ شروع کر دو" شاداب نے شوشہ چھوڑا۔

"آپ کون ہوتے ہیں ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے والے" شگفتہ غصے سے بولی۔"

"چپ رہ بدتمیز! یہ تیرا چچا زاد بھائی ہے۔ تجھ سے بڑا ہے۔ کیا کسی نے تجھے بڑوں کا ادب کرنا بھی نہیں سکھایا۔ جا۔ دفان ہو جا یہاں سے" بیگم صاحبہ غصے سے پھٹ

پڑیں، اور شگفتہ پیر پٹکتی ہوئی چلی گئی۔ بیگم صاحبہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہیں پھر بڑی ہی آہستگی سے پوچھا "شاداب میاں، کیا لڑکا واقعی بہت موٹا ہے"۔

"چچی جان، آپ بھی کن دشمنوں کے بہکائے میں آگئیں۔ لڑکا تو ہیرا ہے ہیرا۔ موٹا وٹا کیا ہے، ہاں ذرا تندرست ہے۔ اور کیوں نہ ہو گاؤں سے اصلی گھی اور باریک چاول آتے ہیں۔ اسی لئے کچھ چھوٹی سی توند کی شکل میں باہر کی طرف نکل آئی ہے بس"۔

"بس کرو میاں۔ میرا تو سن کر ہی جی بولا گیا" بیگم صاحبہ منہ بنا کر بولیں۔

"یعنی اب آپ بھی . . ."

"اور نہیں تو کیا میاں . . ."

"تو گویا یہ پیام بھی گیا ہاتھوں سے! " افسوس!

"اے اس میں افسوس کا ہے کا میاں۔ کیا ایک ہی پیام تھا؟ آٹھ دس پیام اور آئے ہوئے ہیں۔ مگر یہ کمبخت چھوکری مانے تب نا؟ ہر بات میں مین میخ نکالے بغیر تو اسے چین نہیں پڑتا۔"

"چچی جان، دراصل یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے"۔

"نفسیاتی نکتہ؟"

"جی ہاں۔ اگر آپ تھوڑا سا اپنے دماغ پر زور ڈالیں تو یہ بات آپکی سمجھ میں آجائیگی۔ ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ جو بات آپ پسند کرتی ہیں، شگفتہ اسے رد کر دیتی ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ جس لڑکے کو آپ پسند کرتی ہیں وہ اُسے ناپسند کر دیتی ہے"۔

"ہاں ہاں، یہی تو اصل رونا ہے"۔

"جی ہاں۔ اور یہی اصل وہ نکتہ ہے۔ دراصل آپ کی مخالفت کرنے میں وہ فخر محسوس کرتی ہے، آپکی بات کو ٹھکرانا ایک شان سمجھتی ہے"۔

"شاداب میاں سچ پوچھو تو اس چھوکری کو بگاڑنے میں اس کے باپ کا ہی ہاتھ

ہے۔ وہ اس چھوکری سے مل کر مجھے ہر معاملے میں نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ہائے میں کیا کروں؟"

"ہمت سے کام لیجئے بچی جان۔ اگر آپ حوصلہ کھو بیٹھیں گی تو پھر شگفتہ آپ پر چھا جائے گی، اگر آپ نے ایک بار اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو بس پھر زندگی بھر جی حضوری کرتی رہ جایئے گا۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ میاں، اب میں کیا کروں؟ بیگم صاحبہ سٹ پٹا کر بولیں۔

"میری بات مانیئے۔ شگفتہ کی کوئی بات کبھی نہ مانیئے، بلکہ اپنی ہر بات اس سے منوانے کی کوشش کیجئے، اگر آپ اس میں ناکام ہو گئیں تو پھر زندگی بھر اس کی تلافی ممکن نہیں، آپ تو جانتی ہی ہیں اپنی لاڈلی کی فطرت کہیں اس نے گھر کے ہونے والے داماد کو بھی آپ کے خلاف ورغلا دیا تو۔۔"

"تو کیا ہوگا شاداب میاں؟" بیگم صاحبہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"یہ پوچھئے کہ کیا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں داماد تو غیر ہی ٹھہرا۔ وہ آپکی طبیعت اور فطرت کیا جانے، وہ بھی آپ سے اسی طرح پیش آئے گا جسطرح آپ کی لاڈلی پیش آتی ہے۔"

"ایسا تو نہ کہو میاں۔ وہ بھلا ایسا کیوں کرنے لگا؟

"خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ مگر بچی جان جب پیٹ کی اولاد ہی دشمن ہو تو پھر غیر کا کیا بھروسہ؟"

"ہائے مجھ نصیبوں جلی کا کوئی ہمدرد نہیں، وہ بھی نہیں جس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں۔ وہ بھی تو اس چھوکری کے اشاروں پر ناچنے لگے ہیں، ہائے اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی ہمدرد نہیں۔"

"یہ کیوں نہیں بچی جان۔ مانا کہ میں اس قابل نہیں کہ آپکی برابری کر سکوں غریب ہوں لیکن دل کا امیر ہوں۔ میرے پاس دھن دولت بھلے ہی نہیں، مگر

تن من سے آپ کے ساتھ ہوں۔"

"جیتے رہو شاداب میاں۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ بس ایک تم ہی تو اس گھپ اندھیرے میں امید کی کرن ہو۔"

"شکریہ چچی جان۔ میری اس بات کو گرہ میں باندھ لیجئے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن آپ ہمت نہیں ہاریں گی۔ انشاء اللہ جیت آپ ہی کی ہو گی ——— !"

"میں کہتا ہوں چچی جان، شرافت کی بھی حد ہوتی ہے۔" شاداب نے بیگم صاحبہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا شاداب میاں"؟ بیگم صاحبہ گھبرائیں۔

"آپ نے وہ مثل تو سنی ہو گی، ہمدردی کر اور جوتے کھا والی۔ بس وہی صادق آتی ہے مجھ پر۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں شاداب میاں۔"

"کل بھری پارٹی میں شگفتہ نے میری عزت اتار دی۔ کہنے لگی کہ میں چاپلوس ہوں، خوشامد پرست ہوں، آپکے تلوے چاٹتا ہوں۔ اور آپکی دولت پر نعوذ باللہ میری نظر ہے۔"

"اس کمبخت کی یہ مجال۔"

"چچی جان، کیا اس دنیا میں غریب ہونا جرم ہے؟ میرا خدا گواہ ہے چچی جان میں نے کبھی دولت کا لالچ نہیں کیا۔ مجھے تو آپ سے صرف ہمدردی ہے۔ اس میں لالچ کا شائبہ تک نہیں۔ مانا کہ میں مفلس اور کنگال ہوں۔ لیکن شگفتہ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھے یوں ذلیل کرے۔" فرطِ غم سے شاداب کی آواز بھرا گئی۔

"کون کہتا ہے بیٹا کہ تو مفلس اور کنگال ہے۔ اسے تو کیا غیر ہے؟ تو تو ہمارا اپنا ہے، چچا کیا باپ برابر نہیں ہوتا۔ کیا یہ دھن دولت جائیداد تیری نہیں" ———

بیگم صاحبہ بڑے ہی طمطراق سے آئیں اور سیدھی تیر کی طرح جج صاحب کے کمرے میں پہنچیں اور کہا " کان کھول کر سنو! آج میں اس بات کا فیصلہ کر کے دم لوں گی یا تو اس گھر میں میری چلے گی یا پھر ہمیشہ کے لئے اس گھر سے چلی جاؤں گی"۔

"آخر ہوا کیا بیگم، میں کچھ سمجھا نہیں" جج صاحب گھبرا کر بولے۔

"کیا تمہاری بیٹی کے بھلے برے کا فیصلہ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں؟"

"کیوں نہیں بیگم، تم اس کی ماں ہو"

"وہ مجھے ماں سمجھے تب نا۔ خیر میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے اسکی شادی ہوگی تو بس اس لڑکے کے ساتھ جو مجھے پسند ہو۔ سمجھے؟"

"مگر بیگم ......"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ اس چاند کی بائیس تاریخ کو اسکی شادی ہوگی ——— اور شاداب سے ہوگی۔"

"شاداب سے؟ یعنی ہمارے شاداب سے، بیگم تم ہوش میں ہو کہ نہیں"

"کیا تمہیں پاگل نظر آتی ہوں۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولیں"

"یا حیرت! تم ہی ہو نا بیگم جنھوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ شگفتہ کی شادی اس کے ددھیال میں ہرگز نہیں کرونگی، کیونکہ بقول تمہارے میرے خاندان کے لوگ جھگڑالو ہیں، مفلس اور کنگال ہیں، جن میں تم غلطی سے پھنس گئی ہو، اور اب وہی غلطی پھر نہیں دہراؤ گی، بلکہ اپنی بیٹی کی شادی کسی اونچے خاندان میں کسی ڈاکٹر یا انجینئر سے کرو گی"

"ہاں ہاں میں نے ہی کہا تھا یہ سب۔ اور اب یہ بھی میں ہی کہہ رہی ہوں کہ شگفتہ کی شادی ہوگی تو صرف شاداب سے۔ سمجھے؟

"یعنی اُسی شاداب سے جو نہ ڈاکٹر ہے نہ انجینئر، بس بی۔ اے ہے، بے کار ہے۔ اور بقول تمہارے مفلس اور کنگال ہے"

"اجی، مفلس اور کنگال ہوں اسکے دشمن! کیا یہ ساری جائیداد، دھن، دولت ہم قبر میں ساتھ لیجائیں گے۔"

"بھئی سچ پوچھو تو مجھے تمہاری ان باتوں پر یقین نہیں آرہا ہے۔"

"ہاں، تمہیں یقین کیوں آنے لگا؟ لیکن میں کہے دیتی ہوں اب کی بار اگر اس نے انکار کیا تو اس کی اور اپنی جان ایک کر دوں گی۔"

"اجی وہ کیا اسکا باپ بھی انکار نہیں کریگا۔" جج صاحب دھاڑے۔!

"بھئی خوب شاداب میاں! مان گئے تمہاری اس حکمت عملی کو۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے ڈیڈی، لیکن اب میں کیا کروں؟" شگفتہ بے بسی سے بولی "مجھے چارے کے طور پر استعمال کر کے شاداب نے مجھے تو دشمن ٹھہرایا۔"

"ہاں یہ مسئلہ ذرا گمبھیر ہے۔ مگر اسکے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ چچی جان کے دماغ کی صفائی بے حد ضروری تھی۔ اس کے بغیر وہ اس بات پر ہرگز راضی نہ ہوتیں۔"

"اچھا تو یہ بات تھی!" بیگم صاحبہ جو باہر کھڑی یہ گفتگو سن رہی تھیں اندر آگئیں۔ "کیا خوب ہمدردی جتائی ہے؟ میری بچی کو میری نظروں میں دشمن بنا دیا!"

"ممی! شگفتہ ان سے لپٹ گئی۔

"پگلی، اگر تو اپنے دل کی بات مجھے بتا دیتی تو کیا میں تیری مرضی پوری نہ کرتی؟" بیگم صاحبہ شگفتہ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولیں: "ارے میں تیری ماں ہوں ماں۔"

"میں بھی تو یہی کہتا تھا چچی جان کہ آپ ماں ہیں، نہ صرف شگفتہ کی بلکہ میری بھی۔" شاداب بے تیرا بدلکر بولا۔"

"واہ میاں واہ! اچھے بھتیجے ہو۔ مجھے ہی الو بناتے رہے۔"

"کوئی بات نہیں بیگم۔ یہ تمہیں چچی سمجھ کر اب تک الو بناتا رہا۔ اب تم اسے داماد سمجھ کر الو بنا دو۔ حساب برابر ہو جائے گا۔" جج صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا اور بیگم صاحبہ نے آگے بڑھ کر شاداب کو اپنے سینے سے لگا لیا۔



اپریل فول

پہلی اپریل کو "اپریل فول" بنانے کی روایت بڑی پرانی ہے۔ ویسے یہ سچ ہے کہ کسی کو بے وقوف بنانے کا جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش میں انسان خود بے وقوف بن جاتا ہے۔ یعنی الٹی آنتیں گلے پڑ جاتی ہیں۔

بعض مفکّروں کا کہنا ہے کہ انسان اور حیوان میں یہی تو فرق ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو بے وقوف بنا کر خوش ہوتا ہے جب کہ جانوروں میں یہ جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ گویا ایک انسان دوسرے انسان کو بے وقوف بنا کر اپنے ہی ہم جنس کا دل دکھا کر خود کو جانور کی سطح سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔

کسی کو "فول" یعنی بے وقوف بنانا بہت آسان ہے لیکن اپریل کی پہلی تاریخ کو "اپریل فول" بنانا کوئی کھیل نہیں۔ اس روز ہر شخص چوکنا رہتا ہے، ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا ہے۔ بلکہ بعض حضرات تو صرف پھونکتے رہتے ہیں۔ قدم نہیں اٹھاتے "اپریل فول" کا یہ سلسلہ غالباً انسان کے مہذب ہونے کے بعد ہی شروع ہوا۔ چنانچہ آج بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں "اپریل فول" بڑے خاص اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو طرح طرح سے بے وقوف بنانے کے نت نئے ریکارڈ قائم کیے جاتے ہیں۔ اس خاص دن لیک

معمولی آدمی کو بھی اِس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ صدرِ مملکت، وزیراعظم جسے چاہے فول بنائے۔ اس روز بیٹا باپ کو، باپ بیٹے کو، ساس داماد کو، بہو سسر کو بلا تکلف "اپریل فول" بنا کر دادِ تحسین وصول کرتے ہیں جبکہ "ترقی پذیر ممالک" میں یعنی اپنے یہاں ایسی جرأت کرنے والوں کو بدتمیز، بے ادب، چھچھورے وغیرہ کے خطابات سے نوازا جاتا ہے کیونکہ ہمارا سماج اور سماج کے ٹھیکہ دار یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ داماد ساس کا مذاق اُڑائے یا بہو سسر کو اُلّو بنائے ہمارے سماج میں ایسی ساس کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے جو داماد سے پردہ کرتی ہو۔ داماد کو چھوڑ کر وہ ساری دنیا کے سامنے بے پردہ پھر سکتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایسی بھی ساسیں دیکھی ہیں جو طرح طرح کے کیل کانٹوں سے لیس دن کے اُجالے میں شہر کے مشہور بازاروں میں بے پردہ شاپنگ کرتی پھرتی ہیں۔ اور گھر میں داماد سے سخت پردہ کرتی ہیں۔ البتہ ترقی یافتہ ممالک میں ساس داماد کے ساتھ بلا تکلف "بال روم ڈانس" کرتی ہے جبکہ ہندوستانی ساس پردے کے پیچھے بیٹھ کر نہ صرف داماد کو بلکہ جسے چاہے اُنگلیوں پر نچاتی ہے۔ اس ناچ کو "تگنی کا ناچ" کہتے ہیں۔

اپنا ملک چونکہ ترقی پذیر ممالک کے زمرے میں آتا ہے اس لئے اپنے ہاں کسی کو "فول" بنانے کے لئے پہلی اپریل کی کوئی قید نہیں بلکہ جب چاہے جسے چاہے "فول" بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عوام الناس کی اکثریت روزانہ ایک دوسرے کو بے وقوف بناتی رہتی ہے۔ دوکاندار گاہکوں کو، ڈاکٹر مریضوں کو، طالب علم استادوں کو، لیڈر جنتا کو۔ ویسے خالی خولی وعدے کر کے عوام کو بے وقوف بنانا لیڈروں کی خصوصیت ہوتی ہے۔ یا اِسی خصوصیت کی وجہ سے ایسے حضرات لیڈر کہلاتے ہیں یہ اجتماعی طور پر عوام کو اپریل فول بناتے ہیں (ویسے ہر ملک کی گورنمنٹ اجتماعی طور پر عوام کو "فول" بنانے کے لئے ہر تین سال اور پانچ سال کے وقفہ سے الیکشن یعنی انتخابات کے ہنگامے منعقد کرتی ہے) لیڈر چاہے خود ساختہ ہو، یا ساختہ

ہو یا حواس باختہ اس کی ہر تقریر ہر وعدہ "اپریل فول" کی ایک کڑی ہوتا ہے خصوصاً الیکشن کے دوران ان کے مابین عوام کو فول بنانے کے ایسے ایسے فری اسٹائیل مقابلے منعقد ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر نہ صرف آنکھ والے بلکہ نابینا حضرات بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں بلکہ اکثر بے چارے انگلیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ایک دفعہ یکم اپریل کو ایک سیاسی جلسے میں ایک مشہور لیڈر نے جو ہر حلقے سے الیکشن ہارنے کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ پہلی اپریل کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جوشیلی تقریر میں فرمایا۔ اگر اگلے الیکشن میں مجھے منتخب کیا گیا تو سچ کہتا ہوں کسی نوجوان کو بے روزگار نہیں رہنے دوں گا، جتنے بھی ضعیف العمر حضرات زبردستی ملازمت کی کرسیوں سے چپکے ہوئے ہیں" انھیں بہ یک جنبش قلم وظیفہ پر سبکدوش کر کے مالکِ کون ومکاں کا وظیفہ پڑھنے پر مجبور کر دوں گا۔ اشیائے خورد و نوش کی روز افزوں بڑھتی ہوئی قیمتوں کو گھٹا دوں گا یا پھر ہر شہری یا کم از کم اپنے حلقے کے ہر فرد کا معیارِ زندگی اتنا اونچا کر دوں گا کہ وہ بجائے زمین کے خود کو آسمان میں چہل قدمی کرتا ہوا محسوس کرنے لگے۔ ہر گھر میں دودھ کی نہریں بہا دوں گا جو لوگ آج پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں وہ ان نہروں میں ڈبکیاں لگائیں گے اور دودھوں نہائیں گے پوتوں پھلیں گے۔ الغرض لیڈر موصوف نے اتنے سبز باغ دکھائے کہ ہر شخص کا رنگ زرد پڑ گیا۔ جب بھی عوام کو بے وقوف بنانا ہو، کوئی جھوٹا وعدہ کرنا ہو، ہر لیڈر "اپریل فول" کے موڈ میں آجاتا ہے۔

وہی لیڈر جو ساری دنیا کو الو بنانے کے فن میں یکتا ہوتے ہیں اپنی گھر والی کے ہاتھوں خود الو بنجاتے ہیں۔ ویسے بیوی کسی لیڈر کی ہو یا کلرک کی اس کا مقصدِ حیات شوہر نامدار کو ہر گھڑی ہر پل "اپریل فول" بنانا ہوتا ہے۔ شوہر چاہے کتنا ہی محتاط و چالاک ہو، بیوی کی چکر سے بچ نہیں سکتا۔ بلکہ اس کا ستارہ اسی وقت گردش میں آجاتا ہے جب پہلی بار وہ اپنی بیوی کے چہرے سے (گھونگھٹ) پردہ ہٹاتا ہے جو عمر بھر

کرلیے اس کی عقل پر پڑ جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو ہر مرد کے حق میں اس کی شادی خانہ آبادی کا مبارک دن "اپریل فول ڈے" ہوتا ہے۔ اس روز اس کے ساتھ ایسا غیر سنجیدہ مذاق کیا جاتا ہے جو اسے عمر بھر کے لیے سنجیدہ بلکہ رنجیدہ بنا دیتا ہے۔ شادی سے پہلے اگر وہ ردیف و قافیے کا پابند قدیم شاعر تھا تو شادی کے بعد "جدیدیہ" بن جاتا ہے۔ اب ہی کہیے ایک اچھے بھلے شخص کے ساتھ اس سے بڑا غیر سنجیدہ مذاق اور کیا ہو سکتا ہے (ویسے یہ ضروری نہیں کہ ہر "جدید شاعر" شوہر بھی ہو، ہاں ایک شوہر ضرور "جدید شاعر" ہو سکتا ہے)۔

اگر کسی شاعر یا ادیب کو "اپریل فول" بنانا ہو تو اپریل کی پہلی کے انتظار کی قطعی ضرورت نہیں۔ بس سنجیدگی کے ساتھ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ فلاں مقبول عام ڈائجسٹ نے آپ کا فلاں مضمون ڈائجسٹ کیا ہے جو میں نے فلاں بک اسٹال پر کل ہی دیکھا ہے۔ اگر شاعر یا ادیب تازہ واردانِ ادب میں سے ہوئے تو اس روز اس خاص بک اسٹال پر دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے مختلف رسالے الٹتے نظر آئیں گے اور اگر اساتذہ میں سے ہوئے تو بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کریں گے لیکن اگلے روز وہ بھی ضرور بک اسٹال پر نظر آئیں گے۔

ملازمین کی اکثریت پورے تیس دِن تک سرکار کو اپنے مالکوں کو "اپریل فول" بنا کر پوری تنخواہ بمعہ الاونس اور بھتے وغیرہ کے وصول کرنے میں کامیاب ہوتی ہے جو بعد ازاں خود انھیں "فول" بنا کر ان کے بال بچے اور متعلقین ہتیا لیتے ہیں، اسے کہتے ہیں چور پر مور پڑنا۔

عموماً خالی الذہن حضرات یا کم پڑھے لکھے اشخاص بہ آسانی "اپریل فول" بن جاتے ہیں۔ اگر آپ کے شناساؤں میں سے کسی کی دادی یا نانی چل چلاؤ کے قریب ہوں تو انھیں آسانی سے "اپریل فول" بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے دفتر پہونچ کر ان کی مارتی

یا نانی کے انتقال کر جانے کی جھوٹی خبر سنا دیجئے۔ یا کسی ذریعے سے یہ خبر ان تک پہنچا دیجئے پھر دیکھئے کس طرح ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑتے ہیں۔ بلکہ طوطوں کے پیچھے وہ خود اُڑ کر گھر پہنچ جاتے ہیں گھر پہنچ کر جب موصوفہ کو بدستور صحیح سلامت جیتا جاگتا بلکہ پوپلے منہ کو چلاتا ہوا دیکھتے ہیں۔ پہلے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے لیکن جب انھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آج یکم اپریل ہے، ان کا غصہ کافور ہو جاتا ہے یا اسے پینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ (غصہ پینے سے بھوک کھلتی اور بینائی تیز ہوتی ہے)

اعلیٰ و متوسط ہر دو طبقہ کی بیچیں، شریر، تعلیم یافتہ لڑکیاں مختلف قسم کے کھانوں اور مٹھائیوں میں طرح طرح کی ملاوٹ کر کے اپنی سہیلیوں، بھائیوں اور دوستوں کو "اپریل فول" بناتی ہیں۔ مثلاً گلاب جامن شیرے کے بجائے گوندھ میں تیرائے جاتے ہیں چائے میں نمک کی بھرمار تو پانوں میں مرچ مسالے کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں کشتیوں اور خوانوں میں سجا کر ایک دوسرے کے گھر بڑے اہتمام کے ساتھ بھیجی جاتی ہیں بعض اوقات جلے تو خالی پلیٹوں میں اپریل فول کی پرچیاں چسپاں کر کے کچھ یوں سجا کر ایک دوسرے کے ہاں بھیجتے ہیں کہ ہر خالی الذہن شخص کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

ہائی اسکول کے طالب علم اپنی اپنی سمجھ اور معیار کے مطابق ایک دوسرے کو اپریل فول بناتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر یا کلاس ٹیچر جس کسی سے بھی زیادہ دشمنی ہو اس کی یا (اگر دونوں سے دشمنی ہو تو دونوں کی) موت کی جھوٹی خبر اڑا کر اپنی طرف سے تعطیل کا اعلان کر دیتے ہیں۔

اب رہے کالج کے اسٹوڈنٹ تو یہ اس قدر عملی ہوتے ہیں کہ افواہیں اڑانے کے بجائے ناپسندیدہ لیکچرر یا پرنسپل ہی کو اُڑا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری بہ لحاظ رنگ، نسل، مذہب، دنیا کی ہر قوم کو "اپریل فول" بنانے میں انگریز قوم کا جواب نہیں یہ پورے سو برس تک ہمارے آپ کے آبا و اجداد کو مزے سے "اپریل فول" بناتے رہے۔

ویسے کوئی سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کبھی بے وقوف نہیں بنا، ہمیشہ

دوسروں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ کہتے ہیں کسی کو بے وقوف بنانا بھی ایک آرٹ ہے۔ اور بے وقوف بننا اس سے بھی بڑا آرٹ بلکہ ماڈرن آرٹ۔ اور ماڈرن آرٹ کو دیکھ کر یا تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے یا بے ساختہ قہقہے لگانے کو، در اصل ماڈرن آرٹسٹ کی یہ سازش ہوتی ہے کہ دیکھنے والے پر کسی طرح پاگل خانے میں کچھ روز قیام واجب ہو جائے جبکہ آرٹسٹ مہاشے خود پاگل خانے سے فرار شدہ پاگل معلوم ہوتے ہیں۔

ویسے اپریل فول کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ڈر ہے کہیں آپ اس مضمون کو بھی "اپریل فول" کی کوئی کڑی نہ سمجھ بیٹھیں اس لئے مضمون ختم کرتا ہوں۔

"ہیپی اپریل فول" ●●●

زندہ دلانِ حیدرآباد

کی مطبوعات

۱۔ نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۳/۵۰
۲۔ گھوکرو کے کانٹے	علی صاحب میاں	مجموعۂ کلام	۱/۵۰
۳۔ مکرر ارشاد	برق آشیانوی	مجموعۂ کلام	-/۴
۴۔ تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین کا مجموعہ	-/۵
۵۔ یہ اک تبسم	برق آشیانوی	مضامین کا مجموعہ	۳/۵۰
۶۔ مزاجِ شریف	رشید قریشی	" "	۳/۵۰
۷۔ مزاج پرسی	نریندر لوتھر	" "	۳/۵۰
۸۔ چھیڑ چھاڑ	پرویز ید اللہ مہدی	" "	-/۶
